اسالیبِ دعوت

اور

مبلّغ کے اوصاف

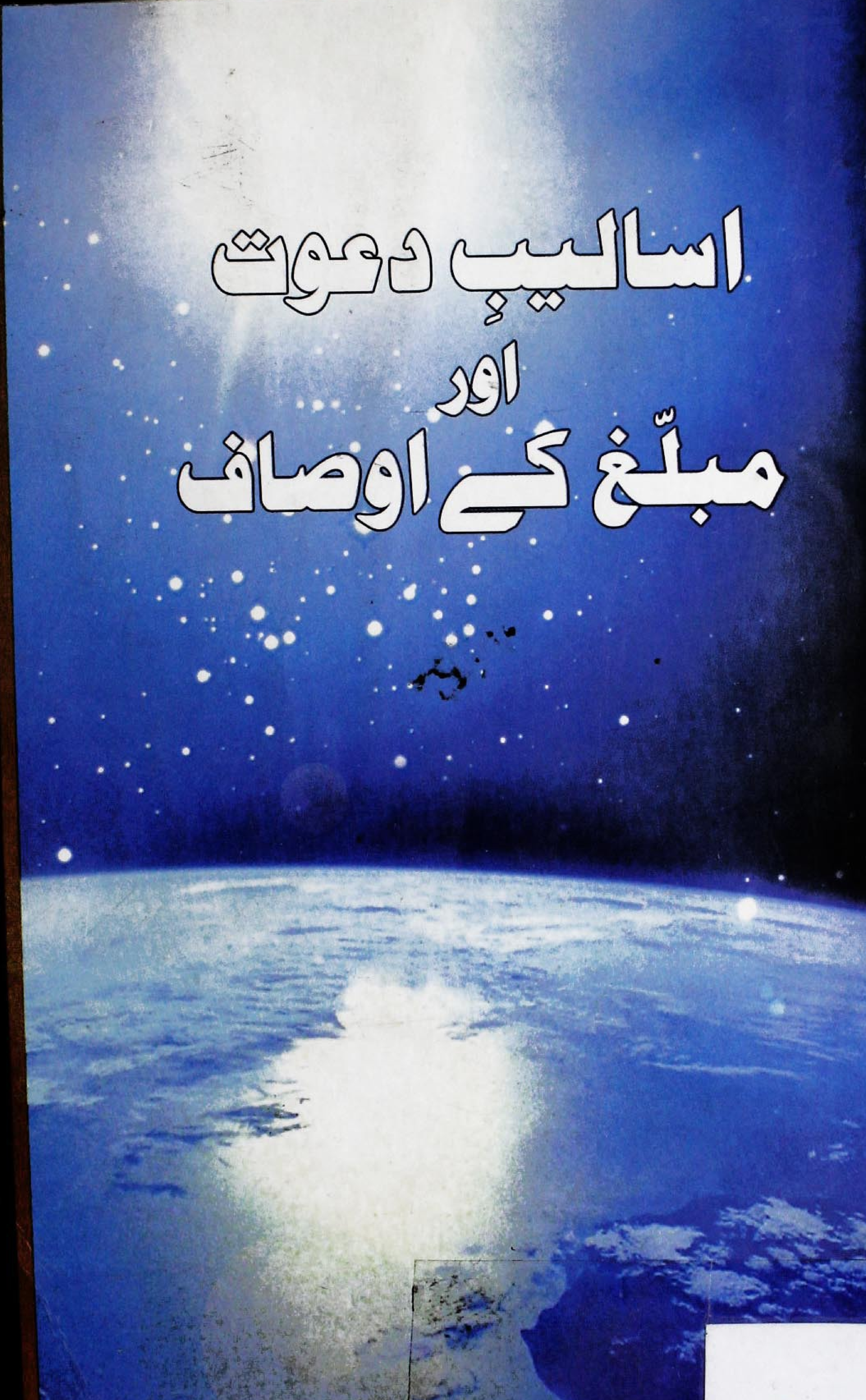

مؤلف: محمد فتح اللہ گولن

Marfat.com

Marfat.com

MTFN
208382
DATA ENTERED

اسالیبِ دعوت اور مبلّغ کے اوصاف

(طرق الارشاد فی الفکر والحیاۃ)

"İRŞAD EKSENİ"

مؤلف

محمد فتح اللہ گولن

مترجم

محمد اسلام

HARMONY
PUBLICATIONS

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ ناشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کا کوئی حصہ کسی شکل میں یا کسی ذریعے سے مثلاً الیکٹرانک، میکینکل بشمول فوٹو کاپی، ریکارڈنگ یا کسی اطلاع کو محفوظ کر کے یا معلومات کے حصول اور اصلاح کی غرض سے دوبارہ شائع یا منتقل نہیں کیا جاسکتا۔

نام کتاب : اسالیبِ دعوت اور مبلّغ کے اوصاف

مؤلف : محمد فتح اللہ گولن

ترجمہ : طرق الارشاد فی الفکر والحیاۃ

مترجم : محمد اسلام

نظر ثانی : عبدالخالق

ناشر : ہارمونی پبلی کیشنز

تعداد : 1000

اشاعت : اشاعت اوّل 2008ء

اشاعت الثانی 2009ء

HARMONY
PUBLICATIONS

9, Main Double Road, F-10/2,
Islamabad-Pakistan
Tel: +92-51-2212250, Fax: +92-51-2112186
www.harmonypublications.pk
harmony.publications@gmail.com

Marfat.com

فہرست مضامین

	پیش لفظ	۵
	کچھ مصنف کے بارے میں	۹
	تقدیم وتمہید	۱۵
	مقدمہ	۲۱

پہلی فصل: تبلیغ کا تعارف — ۲۵ تا ۱۱۱

۱۔	تبلیغ ہماری زندگی کا مقصد	۲۷
۲۔	تبلیغ کی ضرورت اور اس کی اہلیت کی شرائط	۳۶
۳۔	تبلیغ سب سے قیمتی تحفہ	۴۹
۴۔	تبلیغ اور مستقل مزاجی	۵۴
۵۔	خالق ومخلوق کے اعتبار سے تبلیغ کے مختلف پہلو	۶۲
۶۔	دعوت وتبلیغ اور فرد ومعاشرے کا باہمی تعلق	۶۸
۷۔	دعوت، ایمان اور نفاق	۸۲
۸۔	تاریخی واقعات کی روشنی میں دعوت وتبلیغ اور ہلاکت وبربادی	۹۳
ا۔	حضرت نوح علیہ السلام	۹۳
ب۔	حضرت صالح علیہ السلام	۹۶
ج۔	حضرت لوط علیہ السلام	۹۸
د۔	بعض دیگر اقوام	۱۰۱
۹۔	دعوت وتبلیغ، نصرت دین کا پیمانہ	۱۰۵

Marfat.com

دوسری فصل: دعوت وتبلیغ کے اصول وضوابط ۱۱۳ تا ۱۹۸

۱۔ علم اور دعوت وارشاد کا باہمی تعلق ۱۱۵

۲۔ اسلامی حقائق اور دور حاضر سے آگاہی کی اہمیت ۱۲۴

۳۔ قرآن اور دل کا باہمی تعلق ۱۲۵

۴۔ جائز ذرائع کا استعمال ۱۲۸

۵۔ معاوضے کا مطالبہ ۱۲۹

۶۔ مخاطب کے مزاج سے آگاہی اور افہام وتفہیم کے انداز کی اہمیت ۱۳۷

۷۔ ایمان، تبلیغ اور عمل کے نقطہ نظر سے ۱۵۶

۸۔ تزکیہ اور اخلاص کی اہمیت ۱۷۹

۹۔ اہل ثروت واقتدار کے ساتھ تعلقات کا معیار ۱۸۵

۱۰۔ مستقل مزاجی ۱۸۷

۱۱۔ بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قوانینِ فطرت کی مخالفت سے اجتناب ۱۹۰

تیسری فصل: مبلغ تحریک کے آئینے میں ۱۹۹ تا ۲۲۳

۱۔ شفقت ۲۰۱

۲۔ ایثار وقربانی ۲۰۷

۳۔ دعا ومناجات ۲۰۸

۴۔ منطقی طرز استدلال اور واقعیت پسندی ۲۱۰

۵۔ عفوودرگزر ۲۱۲

Marfat.com

پیش لفظ

قرآن کریم نے امت مسلمہ کی تعریف پہچان اور مقصد وجود کو صرف دو الفاظ میں بیان کر دیا ہے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ گویا امت مسلمہ ایک تعمیری، مثبت اور متحرک جماعت کا نام ہے جو تطہیر معیشت، تطہیر سیاست اور تطہیر معاملات کی دعوت دینے اور قیام حق و عدل کے فریضہ پر مامور کی گئی ہے ہے۔ اس قرآنی تعریف میں جو بات آج کے نوجوان کے لیے قابل غور ہے وہ یہ کہ اُمت مسلمہ کسی قومیت، وطنیت، لسانیت یا جغرافیائی خطہ سے وابستگی کا نام ہے بلکہ عالمگیر طور پر اس جماعت اور گروہ کا نام ہے جو بھلائی کے قیام، بھلائی کی تعلیم اور بھلائی کی اشاعت میں انفرادی اور اجتماعی طور پر مصروفِ عمل ہو۔

قرآن کریم اور خاتم النبیین ﷺ کی عملیت کا اظہار بہترین شکل میں امر بالمعروف کی تعلیم سے ہوتا ہے کیونکہ امر بالمعروف محض زبان سے کلمہ حق ادا کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ حق کے زبان سے اس طرح لینے کا نام ہے کہ ایک فرد اور ایک قوم خود اس پر عمل پیرا ہو۔ اس لیے فرمایا گیا:

"يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○"

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم وہ کہو جو کرتے نہیں" (الصف ۶۱: ۲-۳)

معروف کی دعوت کے ساتھ ساتھ خود اپنے طرزِ عمل میں معروف کو اختیار کرنا اس کی شرطِ اول ہے۔ چنانچہ اُمت مسلمہ کے ہر ہر فرد پر بلا تفریق جنس، عمر، مقام انسانوں کو بھلائی اچھے اخلاق اور پاکیزہ زندگی کی دعوت دینا فرض کر دیا گیا ہے۔ سورہ توبہ میں فرمایا گیا ہے:

"مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ساتھی (دوست) ہیں بھلائی

Marfat.com

کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی۔'' (التوبہ ۹:۷۱)

یہ بات واضح کرنے کے بعد کہ مومن مردوں اور عورتوں کی رفاقت، تعاون اور دوستی کی بنیاد درحقیقت امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ہے۔اس آیت سے اجتماعی طور پر امر بالمعروف کے کرنے کی دلیل ملتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ امر بالمعروف کس طرح کیا جائے اور برائی کو کس طرح روکا جائے۔ قرآن کریم اور سیرت خاتم النبیین ﷺ کا یہ اعجاز ہے کہ ان تمام سوالوں کے جوابات جو دعوت، داعی اور مدعو سے متعلق ہوسکتے ہیں ان سب کا اصولی اور عملی جواب ان دونوں کے صفحات میں موجود ہے۔چنانچہ اگر قرآن کریم یہ کہتا ہے وہ امر بالمعروف قولِ لین سے کیا جائے یعنی وقت کی طاغوتی قوتیں ہوں یا کفر وشرک کے علمبرداران سے بھی بھلے اور مناسب انداز میں خطاب کرتے ہوئے دعوت حق ان تک پہنچائی جائے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس روانہ کرتے کرتے وقت خالق کائنات کی ہدایت ہی تھی کہ اس سے بھی عمدہ انداز میں بات کی جائے۔قرآن کے اس حکم اور اصول کی عملی مثال اسوہ حسنہ ﷺ میں عمدہ ترین شکل میں مل جاتی ہے۔داعی کی صفات میں یہ بات شامل ہے کہ وہ اپنے مخاطبین کی نفسیات، ان کی قابلیت اور پس منظر اور ان سے مسائل سے پوری آگاہی کے ساتھ ان سے مخاطب ہو اور انہیں دین سے قریب لائے۔انہیں امید اور خوش خبر دے تاکہ وہ رغبت کے ساتھ دین میں داخل ہوں۔ان تمام پہلوؤں سے قرآن کریم اور سیرت پاک کا مطالعہ کیا جائے تو ہر ہر آیت اور ہر ہر ورق سیرت ایک داعی کے لیے روشن چراغ (سراجاً منیرا) کا کام کرتا ہے۔استاد محمد فتح گولن عصرِ حاضر کے ان دعاۃ میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی تمام زندگی انسانیت کو اس کے خالق و مالک کی اطاعت و بندگی کی طرف بلانے کے لیے وقف کر دی ہے۔ان کے تحریر میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے استدلال، سید سعید نورسی کے پر حکمت انداز، امام حسن البناء کے

Marfat.com

سوز، سید قطب کی سی حرارت ایمانی اور علامہ اقبال کی حمیتِ دینی جھلک نظر آتی ہے۔

''اسالیبِ دعوت اور مبلغ کے اوصاف'' استاد فتح اللہ کے دعوتی خطابات پر مبنی ایک جامع کتاب ہے۔ جس میں قرآن وحدیث کی بنیاد پر عصرِ حاضر میں اسلامی دعوت کے طریقے اور داعی کی صفات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ میرے لیے یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ جن نکات کو استاد فتح اللہ نے اس کتاب میں اجاگر کیا ہے 1984ء میں جب مجھے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں دعوۃ اکیڈمی قائم کرنے کا موقع ملا تو جن مقاصد کے لیے اسے قائم کیا گیا تھا وہ بالکل وہی تھے جن کی طرف استاد فتح اللہ نے متوجہ کیا ہے۔

اس موضوع پر استاد عبداللہ کریم زیدان، استاد ابوالاعلیٰ مودودی، امام حسن البناء، استاد مصطفےٰ مشہور، استاد عبدالبدیع سقر، استاد فتحی یکن اور دیگر اساتذہ نے جن مضامین دعوت پر امت کو متوجہ کیا تھا استاد گولن کی یہ تحریر انہیں موضوعات پر ایک جامع لیکن مختصر تحریر ہونے کی بنیاد پر ایک ممتاز مقام رکھتی ہے اور اس اردو ترجمہ کی شکل میں اردو خوان طبقہ کے لیے ایک قیمتی علمی تحفہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر خلوص تحریر کو قبولیت سے نوازے اور امتِ مسلمہ کو دعوت الیٰ اللہ اور امر بالمعروف کے ذریعہ دوبارہ اعلیٰ مقام اور انسانیت کی قیادت کا فریضہ ادا کرنے کے قابل بنائے۔ امین!

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

وائس چانسلر رفاہ یونیورسٹی اسلام آباد

Marfat.com

Marfat.com

کچھ مصنف کے بارے میں

شیخ محمد فتح اللہ گولن ۱۹۳۸ء میں صوبہ ارضروم کے شہر 'حسن قلعہ' کے ایک گاؤں 'کورو جک' میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ایک دیندار گھرانے میں پرورش پائی۔ آپ کے والد 'رامز آفندی' علمی، ادبی اور دینی لحاظ سے قابلِ احترام شخصیت سمجھے جاتے تھے۔ آپ کی والدہ 'رفیعہ خانم' دینداری اور قوتِ ایمانی کی وجہ سے مشہور تھیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے محمد کو چار سال سے بھی کم عمر میں قرآن کی تعلیم دلانے کا خصوصی اہتمام کیا۔ وہ اسے آدھی رات کو بیدار کر کے قرآن کریم سکھایا کرتیں۔

مصنف نے عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ آپ کے والد ماجد کے گھر اس علاقے کے معروف علماء اور صوفیائے کرام کا آنا جانا رہتا تھا جس کی وجہ سے محمد فتح اللہ کو ابتدائے عمر میں ہی بڑے بڑے حضرات کی مجالس سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔

ابتدائی تعلیم

آپ نے ابتدائی تعلیم ایک دینی مدرسہ میں حاصل کی۔ آپ نے دینی علوم کے ساتھ ساتھ روحانی تربیت پر بھی توجہ دی۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپ خانقاہ جاتے رہتے تھے۔ آپ نے دینی علوم اپنے علاقے کے ممتاز ترین اساتذہ سے حاصل کئے۔ چنانچہ آپ نے عربی گرامر، بلاغت، فقہ، اصول فقہ اور عقائد کی تعلیم 'عثمان بکتاش' سے حاصل کی، آپ نے روایتی اور فلسفیانہ علوم کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اپنی تعلیم کے دوران آپ نے 'رسالہ النور' کا مطالعہ کیا۔ اسی دوران طلبہ نور کی تحریک سے بھی آپ کا تعارف ہوا جس سے آپ بہت متاثر ہوئے۔ یہ تجدید و احیاء کی ایک ہمہ گیر تحریک تھی جس کے بانی و قائد 'رسائل النور' کے مؤلف علامہ بدیع الزمان سعید نورسی تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ کے مطالعے میں وسعت اور آپ کی ثقافت میں تنوع

Marfat.com

پیدا ہوتا گیا۔آپ نے مغربی ومشرقی تہذیب ،فکراور فلسفے کا گہرائی سے مطالعہ کیااور عصری علوم مثلاً فزکس، کیمیا، فلکیات اور حیاتیات وغیرہ سے بھی واقفیت حاصل کی۔

محمد فتح اللہ سے شیخ محمد فتح اللہ تک

بیس سال کی عمر میں محمد فتح اللہ کی 'ادرنہ' کی جامع مسجد 'اُچ شرفلی' میں بطور امام تقرری ہوئی، جہاں انہوں نے اڑھائی سال زہداور مجاہدۂ نفس میں گزارے، آپ مسجد میں ہی رہتے اور بغیر ضرورت کے باہر نہ نکلتے۔

آپ نے اپنے دعوتی کام کا آغاز 'ازمیر' شہر کی جامع مسجد 'کستانہ بازاری' سے ملحق 'مدرسة تحفيظ القرآن' سے کیا۔اس کے بعد آپ نے چلتے پھرتے وعظ ونصیحت کا سلسلہ شروع کیااور 'مغربی اناطولیہ' کے سارے گردونواح کا دورہ کیا، چونکہ دلوں میں پیاس موجود تھی اور روحوں کو ایسے مرشد کی تلاش تھی، جو انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا راستہ دکھائے، اس لیے آپ نے ۱۹۷۰ء میں نوجوانوں کے لیے تربیتی کیمپ لگانے کا سلسلہ شروع کیا، جن میں آپ اپنے خطبات کے ذریعے دلوں کی تربیت کرتے، انہیں گناہوں کی میل سے پاک کرتے اور انہیں اپنے خالق و پروردگار کی یاد دلاتے۔

۱۲ مارچ ۱۹۷۱ء کو اس وقت کی حکومت پر فوجی دباؤ کے نتیجے میں آپ کو اس الزام گرفتار کرلیا گیا کہ آپ ایک خفیہ تنظیم کے ذریعے موجودہ معاشرتی، سیاسی اور معاشی نظام تبدیل کرنے اور عوام کے دینی جذبات کو غلط مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

آپ چھ ماہ قید میں رہے۔اس دوران آپ پر مقدمہ چلتا رہا،لیکن آخرکار آپ باعزت طور پر رہا ہو گئے۔آپ نے اپنے کام کا دوبارہ آغاز کیا۔حکومت نے آپ کو 'ادرمیت' نامی شہر بھیج دیا، جہاں سے آپ 'مانیسا' منتقل ہو گئے۔اس کے بعد آپ صوبہ 'ازمیر' کے شہر 'بورنوفا' چلے آئے، یہاں آپ نے ۱۹۸۰ء تک قیام کیا۔

اس دوران آپ چلتے پھرتے واعظ کی حیثیت سے ایک ایک شہر کا دورہ کرتے اور مساجد میں لوگوں کو پندونصیحت کرتے۔اس کے ساتھ ساتھ آپ علمی، دینی، معاشرتی، فلسفیانہ اور

Marfat.com

فکری موضوعات پر لیکچر دیتے اور خصوصی سیمینارز، مجالس اور اجتماعات کا انتظام کرتے، جن میں آپ لوگوں خصوصاً نوجوانوں کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے ان سوالات کے جوابات دیتے جن کی وجہ سے وہ دین کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار ہو چکے ہوتے۔ آپ کے جوابات سے لوگوں کی تشفی ہو جاتی، اس لئے لوگ آپ کی طرف رجوع کرتے اور آپ سے راہنمائی لیتے۔

اس جماعت نے کسی مالی یا دنیوی مفاد کی پرواہ کئے بغیر ترکی کے قوانین کے حدود میں رہتے ہوئے مختلف قسم کے مدارس قائم کیے، کتابیں لکھیں اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن اسٹیشن قائم کئے۔ سوویت یونین کی شکست وریخت کے بعد اِن اداروں کا دائرہ کار ساری دنیا خصوصاً وسطی ایشیا کی ان ریاستوں تک پھیل گیا، جو ستر سال سے روس کے ملحدانہ اور کمیونسٹ تسلط کا شکار تھیں۔

مکالمہ

شیخ فتح اللہ نے ۱۹۹۰ء کے بعد مختلف جماعتوں، صحافیوں، تعلیم یافتہ طبقوں اور مذاہب وافکار کے درمیان باہمی افہام وتفہیم اور مکالمے کی تحریک کا آغاز کیا۔ اس تحریک کی بنیادی خصوصیت نرمی اور ہر قسم کے تعصب اور کشیدگی سے دوری تھی۔ اس تحریک کے اثرات نہ صرف ترکی میں بلکہ ترکی سے باہر بھی محسوس کئے گئے۔ اس تحریک کے اثرات کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پوپ کی دعوت پر شیخ فتح اللہ نے ویٹی کین سٹی میں پوپ سے ملاقات کی، جس میں شیخ فتح اللہ نے اس بات پر زور دیا کہ چونکہ ذرائع ابلاغ کی ترقی کی بدولت ساری دنیا ایک گاؤں بن چکی ہے، اس لیے نزاع اور عداوت پر مبنی کوئی تحریک کسی مثبت نتیجے تک نہیں پہنچ سکتی، لہٰذا دنیا کے تمام دروازے انسان کے لیے کھلے ہونے چاہئیں۔ اسلام کو ایسے انداز سے نہیں پیش کرنا چاہیے، جس سے اس پر دہشت گردی کا لیبل لگے۔ صرف اسلام دشمن عناصر ہی اس طرح کی سوچ رکھ سکتے ہیں، ورنہ اسلام اور دیگر مذاہب کے درمیان تو باہمی تعاون کے وسیع امکانات موجود ہیں۔

Marfat.com

خدمات

شیخ کی خدمات کا جائزہ درج ذیل نقاط کی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے:

الف: آپ کے خطبات، مواعظ، لیکچرز اور مجالس پر مشتمل ہزاروں کی تعداد میں کیسٹیں موجود ہیں۔

ب: آپ کی طبع شدہ کتب درج ذیل ہیں:

(۱) أسئلة العصر المحيّرة (چار جلدیں)

(۲) الموازين أو أضواء على الطريق

(۳) العصر والجيل

(٤) الانسان فى تيار الأزمات

(٥) نحو الجنة المفقودة

(٦) صفحة الزمن الذهبية

(۷) أنفاس الربيع

(۸) عند ما نقيم معبد روحنا

(۹) النور الخالد: مفخرة الانسانية محمد ﷺ (دو جلدیں)

(۱۰) فى ظلال الايمان

(۱۱) تلال القلب الزمردية (دو جلدیں)

(۱۲) براعم الحقيقة فى جيل الألوان (دو جلدیں)

(۱۳) تأملات فى سورة الفاتحة

(۱٤) من فصل لفصل (چار جلدیں)

(۱٥) المنشور (چار جلدیں)

(۱٦) روح الجهاد وحقيقته فى الاسلام

(۱۷) الحياة بعد الموت

(۱۸) القدر فى ضوء الكتاب والسنة

Marfat.com

(۱۹) طرق الارشادفی الفکروالحیاۃ

(۲۰) البعد المیتا فیزیقی للوجود (دوجلدیں)

(۲۱) ریشۃ العازف المکسورۃ [مجموعہ اشعار] (دوجلدیں)

(۲۲) تربیۃ الا طفال

آپ کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ انگریزی، جرمن، بلغاری، البانوی، انڈونیشی، روسی اور کوریائی زبانوں وغیرہ میں ہو چکا ہے۔

اردو زبان میں درج ذیل کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں:

۱۔ تقدیر کتاب وسنت کی روشنی میں

۲۔ المیزان یا چراغ راہ

۳۔ روح جہاد اور اس کی حقیقت

۴۔ اسالیب دعوت اور مبلغ کے اوصاف

۵۔ اضواءِ قرآن در فلکِ وجدان

۶۔ النور الخالد محمد ﷺ مفخرۃ الانسانیۃ

۷۔ روح کے نغمے اور دل کے غم

۸۔ تخلیق کی حقیقت اور نظریہء ارتقاء

آپ کی بقیہ کتب کا اردو ترجمہ بھی ان شاء اللہ جلد شائع ہو جائے گا۔

چونکہ یہ کتاب مساجد میں دیئے گئے مواعظ اور طلبہ ومریدین کے لیے منعقد کی گئی خصوصی مجالس میں سوالات کے جوابات کا مجموعہ ہے جسے مصنف کے شاگردوں نے تحریر کیا اور مصنف کی رضا مندی اور تصحیح کے بعد شائع کیا جا رہا ہے۔ اس لیے بعض مقامات پر اس کے اسلوب اور مضامین پر خطیبانہ انداز کی چھاپ بھی نظر آتی ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

تقدیم و تمہید

☆ جب تک تمہارے دل میں شوق، روح میں حزن والم اور دماغ میں فکر وغم کے چراغ روشن نہ ہو جائیں اس وقت تک خاموش رہو، ورنہ تمہاری گفتگو کوئی بھی غور سے نہ سنے گا۔

☆ جب تک تمہارے دل و دماغ پر یہ احساس غالب نہ آجائے کہ تمہاری دعوت کائنات کے لیے دل، وجود کے لیے روح، دنیا کے لیے ترازو اور امن وامان کے لیے ضامن کی حیثیت رکھتی ہے، اس وقت تک تمہارے دل میں سارے جہاں کا سامنا کرنے کا حوصلہ کہاں پیدا ہو سکتا ہے؟

☆ جب تک تمہاری رگوں میں ایسا خون جوش نہیں مارے گا، جو تمہیں اپنے سے زیادہ صلاحیتوں اور اپنے سے زیادہ طاقتور لوگوں کو چیلنج کرنے پر ابھارے، اس وقت تک تم کیسے چیلنجوں کا جواب اور حیرت انگیز کارنامے سرانجام دو گے؟

☆ اگر تمہیں سارے عالم میں ایمان کو درپیش خطرات کا احساس ہے اور تم ایمان کی حفاظت اپنی ذمہ داری بھی سمجھتے ہو تو تم دنیا سے کیونکر امید لگائے بیٹھے ہو کہ وہ تمہاری بات توجہ سے سنے گی۔

☆ اگر معنوی اور روحانی مربضوں کے ساتھ تمہاری گفتگو میں شفقت و رحمت کی چاشنی نہ ہوئی تو تمہاری بات کا ان پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا۔

☆ جب تک تمہیں اِس بات کا احساس نہ ہوگا کہ فرشتے اپنی سانسوں کو تمہاری سانسوں کے ساتھ ملا کر اور اپنے پروں کو تمہارے چہروں پر پھیر کر تمہاری بات کی تصدیق کر رہے ہیں، اُس وقت تک تمہیں اُس سچائی کی خوشبو ہرگز محسوس نہ ہوگی، جس کے لئے سامعین اپنے دل و دماغ کے دریچے کھول دیتے ہیں۔

Marfat.com

☆ اگر تمہاری دعوتی ذمہ داریاں تمہارے ادراک میں اضافے، دنیا کے روحانی اور فکری پہلوؤں کے فہم میں ترقی اور ایسے اسلوبِ بیان کی دریافت کا باعث نہیں بنتیں، جس کے ذریعے تمہیں سمجھا جا سکے تو تمہاری تمام تر کوششیں غیر سنجیدہ اور بے ثمر ثابت ہوں گی۔ غیر سنجیدہ مبلغین فائدے کی بجائے نقصان اور ترقی کی بجائے تنزلی کا باعث بنتے ہیں۔

☆ اگر تم روحانی اعتبار سے تھکاوٹ کا شکار ہو، تمہارے دل کی حرارت کم پڑ گئی ہے اور تمہاری فکر کے چراغوں کا تیل ختم ہو چکا ہے تو تم روحانی اعتبار سے مر چکے ہو۔ ایسی صورت میں خاموشی گفتگو کرنے سے بدرجہا بہتر ہے۔

☆ اگر تم تنگی اور تکلیف کا باعث بننے والی نفسانی خواہشات سے اپنے دل کو پاک نہیں کر سکتے تو تم اپنے کردار کو کیسے پاکیزہ بنا سکو گے؟

☆ اگر یقین کی روشنی نے تمہارے جسم کو منور نہیں کیا تو تمہاری گفتگو میں گرمائش اور تمہاری آواز میں قوت کیسے پیدا ہوگی؟

☆ اگر تم نے اپنے دل کو نہیں سنوارا تو تم دوسروں کے دلوں کو کیسے سنوارو گے؟

☆ اگر تمہارا اپنا دل اچھے اوصاف سے مزین نہیں تو تم دوسروں کے دلوں کو فضائل سے کیسے مزین کرو گے؟

مذکورہ بالا نقاط اس کتاب کی چند عمومی خصوصیات ہیں۔ فاضل مصنف، عظیم داعی اور استاد فتح اللہ گولن مدظلہ نے دعوت کے میدان میں بڑی تکلیفیں جھیلیں۔ انہیں اس سلسلے میں کافی تجربہ حاصل ہے۔ ان کی زندگی میں بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں، جن سے داعی حضرات ہر جگہ راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں فاضل مولف نے اس سلسلے میں بہت سی نئی چیزوں کا اضافہ بھی کیا ہے، جن کا مادی اور معنوی دونوں اعتبار سے ایمان کی ترقی میں بھرپور کردار ہے۔ مصنف کی ان کاوشوں کا دائرہ نہ صرف جدید ترکی میں ہر جگہ پھیلا ہوا ہے، بلکہ ترکی سے باہر اور بھی بہت سے ممالک تک اس کا دائرہ اثر پھیل چکا ہے۔

Marfat.com

اس کتاب کے مطالعے کے دوران ہمیں مصنف کے قلم کی روانی کے ساتھ ساتھ اس کی روح کے احساسات کا بھی مشاہدہ کرنا چاہیے، اس لئے کہ قلم ان احساسات کی طرف صرف اشارہ ہی کرسکتا ہے، وہ انہیں مکمل طور پر بیان کرنے سے عاجز ہے۔

یہ کتاب مصنف کی روح کے احساسات کی بہترین ترجمان ہے، جو مضبوط بنیادوں پر قائم ایک عظیم فلک بوس ایمانی محل کے مشابہ ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے ہمیں روح کی عظمت اور ارادے کی قوت کا احساس ہوتا ہے۔ جب یہ دونوں کسی داعی میں جمع ہو جائیں تو ناممکن کو ممکن بنادیتی ہیں۔

اس موضوع پر لکھی جانے والی دیگر کتابوں سے مختلف ہونے کی وجہ سے یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ میری رائے میں اس کتاب کے لئے کوئی دوسرا عنوان زیادہ مناسب ہوتا مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کا موضوع 'فقہ المعاناة والألم من أجل الدعوة' ''دعوت کی خاطر صعوبتیں اور مشقتیں اٹھانے کی فقہ'' ہونا چاہیے تھا۔ یہ کتاب نہ صرف انسان کے احساسات کو ضیاء بخشتی ہے، بلکہ اسے گہرے، فطرتی اور ایمانی جذبات سے سرشار کرتی ہے۔ پوری کتاب گویا اسی فطرتی جذبے کی عملی تحریک اور اس کے اہداف ومقاصد کی تعبیر ہے، نیز اس میں اُس روحانی اور فکری اضطراب کا بھی سدباب کیا گیا ہے، جس کا موجودہ دور کی دعوتی تحریکیں شکار ہیں۔ اس کتاب کا مقصد دعوتی عمل کے ان بنیادی اصولوں کو منظم کرنا ہے، جن کی بدولت داعی غیر ضروری اور غیر منظم امور میں مشغول ہونے سے بچ سکتا ہے۔ اس طرح دعوتی عمل کی قوت محفوظ رہتی ہے اور بے فائدہ امور میں صرف ہو کر ضائع نہیں ہوتی۔

فاضل مصنف کی رائے میں جس طرح ہماری زندگی خالقِ عظیم کے فن وجمال اور تخلیق کا شاہکار ہے، اسی طرح دعوت بھی داعی حضرات کے دل وجان میں رچ بس جانی چاہیے۔ جس قدر داعی حضرات اپنے دعوتی کام میں اپنی زندگی، روح اور دماغ خرچ کریں گے، اسی قدر اس میں نمو اور وسعت پیدا ہوگی۔ جس قدر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں گے، اس کی رحمت کے طلبگار ہوں گے، اس کے سامنے عاجزی کا اظہار کریں گے اور اس کی چوکھٹ پر عاجزی سے کھڑے

Marfat.com

ہوں گے اسی قدر ان کی دعوت میں تقدس، پاکیزگی اور خوبصورتی پیدا ہوگی یہاں تک کہ وہ مکمل طور پر ان کا مزاج، عادت اور ادب بن جائے گی اور دیگر تمام دعوتوں سے واضح طور پر ممتاز نظر آنے لگے گی۔

اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کیونکہ استاد محترم محمد فتح اللہ کے نزدیک ایمان ایک ایسی متحرک قوت ہے، جسے تمام پہلوؤں سے متحرک رہنا چاہیے۔ اس لئے کہ یہ قوت جہاں ایک طرف انسان کے روحانی ادراکات کو آسمان کی بلندیوں تک لے جاتی ہے تو وہیں یہ انسان کی رگ و پے میں اتر کر اس کی بوجھل روح اور منجمد خون میں نئی زندگی ڈال دیتی ہے۔ ایمان کی بلندی ستاروں کی عظمت کی مانند عالمی اور متحرک ہوتی ہے۔ اگر اس کی حرکت رک جائے تو وہ بجھ کر معدوم ہو جائے یہی حال اس کائنات کی اُن تمام اشیاء کا ہے، جن کی زندگی اللہ تعالیٰ نے حرکت میں رکھی ہے۔

روح کی بلندی اور ارادے کی قوت استاد محترم محمد فتح اللہ کی شخصیت سے پھوٹ پھوٹ کر ان کے شاگردوں کی طرف ایسے منتقل ہوتی ہے، جیسے صبح کی روشنی رات کی ظلمت کو منور کر دیتی ہے۔ وہ اور ان کے شاگرد ایک دوسرے کی زندگیوں میں شریک رہتے ہیں۔ مصنف ان میں سمجھ بوجھ اور بیداری پیدا کرتا ہے تو اس کے شاگرد اس میں غور وفکر، رحمت اور شفقت کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ وہ خاموش رہے یا محوِ گفتگو ہو اس کا دل ان کے ساتھ دھڑکتا ہے، یہی حال اس کے شاگردوں کا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہتے ہیں اور حزن والم کی حالت میں ایک دوسرے کو اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔ انہیں اپنے استاد کے غموں سے ایسی زبردست قوت ملتی ہے، جس کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہیں سکتی۔ اسے ان کے غموں میں ایسی ایمانی قوت محسوس ہوتی ہے، جسے کوئی چیز تھکا سکتی ہے اور نہ ہی حوادث اسے بوجھل بنا سکتے ہیں۔ زمانہ انہیں کوئی گزند پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی برائی ان کے قریب پھٹک سکتی ہے۔

وہ اس کی شخصیت میں خدائی سربستہ اسرار محسوس کرتے ہیں، جن میں سے بعض کو تو انہوں نے پالیا ہے اور بعض ابھی تک منکشف نہیں ہوئے، لیکن شاید آئندہ کسی زمانے میں ان کا بھی انکشاف ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے دل، روح اور فکر سے پھوٹنے والے انوارات و برکات

Marfat.com

کو بڑے احترام ومحبت سے وصول کرتے ہیں۔

چونکہ اس کی زندگی ان کے لئے اسوہ حسنہ کی حیثیت رکھی ہے اور ایمان کی خاطر انہوں نے اپنی جان ومال کو وقف کر رکھا ہے، اس لئے انہیں ایمان کی خاطر بڑی سے بڑی مشکل کا سامنا کرنے میں لمحہ بھر کے لئے بھی تردد نہیں ہوتا۔ ان کے استاد کی تعلیمات کے مطابق زندگی دو غیر متناہی سلسلوں کے درمیان ایک متحرک لمحہ ہے جو ماضی کی ابدیت کو مستقبل کی ابدیت سے جدا کرتا ہے۔ زندگی کے اس لمحے کا ایمان کے حقیقی سکون کا ادراک کئے بغیر گزر جانا انتہائی سہل ہے۔

جناب شیخ کی تعلیمات کا اثر ان کی گفتگو کے الفاظ کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ ان کی روح دلوں سے ہم کلام ہوتی ہے اور اپنا سارا دردِ دل دوسری روحوں میں منتقل کر دیتی ہے۔ گزشتہ چھ صدیوں کے مسلمانوں کے تمام غم ان کی روح میں سما گئے ہیں۔ وہ ان دکھوں سے آشنا اور ان کی تلخیوں سے واقف ہیں۔ مسلمانوں کی حالت زار پہ ان کا دل بہت دکھتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ مایوس نہیں۔ انہیں اِن مشکل حالات میں بھی امید کی کرن نظر آ رہی ہے۔ یہ ایک ایسا دکھ ہے جو انسان میں گہرائی اور دور اندیشی پیدا کر دیتا ہے۔ اسی گہرائی اور دور اندیشی میں امید پنہاں ہے اور یہیں سے آسانیاں پیدا ہوتی ہیں۔

وآخِرُ دَعوَانا أنِ الحَمدُ لِلّٰہِ رب العالمین والسلام علی رسولنا الأمین۔

ادیب ابراہیم دباغ

Marfat.com

Marfat.com

مقدمہ

حضرتِ انسان ایک ایسی مخلوق ہے، جو جہاں اپنی کمزوریوں کے باعث 'أَسْفَلَ سٰفِلِينَ' کے مقام تک گر سکتی ہے وہاں اپنی خوبیوں اور فضائل کی بدولت فرشتوں پر بھی سبقت لے جا سکتی ہے۔ انسان کی اصلاح کی خاطر ترتیب دیا جانے والا کوئی بھی ایسا تربیتی نظام جس میں انسان کی شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں کو پیشِ نظر نہ رکھا گیا ہو ناقص رہے گا۔

اسلام انسان کو ایک ناقابلِ تقسیم کل کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ وہ اس کی خامیوں کا زجر و تنبیہ کے ذریعے ازالہ کرنے اور اس کی خوبیوں کو ترغیب اور حوصلہ افزائی کے ذریعے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنت میں خوف و رجا، جنت و دوزخ اور رحمت و عذاب کا ساتھ ساتھ ذکر ملتا ہے۔ اسلام کی نظر میں ایک مثالی انسان نہ تو خوف کی شدت سے حواس باختہ اور مایوس ہوتا ہے اور نہ ہی حد سے زیادہ رجائیت پسندی کی وجہ سے سرکشی اور غرور میں مبتلا ہوتا ہے۔

دینی زندگی کا حصول اور تسلسل احکام و قوانین کی پابندی کے بغیر ممکن نہیں۔ جب انسان اپنی روحانی ترقی کے باعث عالمِ روحانی میں داخل ہوتا ہے تو استقامت، لغزشوں سے حفاظت اور صراطِ مستقیم سے بھٹکنے سے بچنے کے لیے اسے بعض تعزیراتی احکام (مثلاً ترغیب و ترہیب) کا پابند بننا پڑتا ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ تعزیراتی احکام ناگوار اور تکلیف دہ محسوس ہوتے ہیں، لیکن نتیجے کے اعتبار سے ان میں انسان کا ہی فائدہ ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک ناگوار نظر آنے والا چہرہ اچانک جنت کی کسی حور کے چہرے کی طرح حسن و جمال سے جگمگا اٹھے۔

زندگی کے وہ تمام نظام جو انسان کو صرف ایک پہلو سے موضوعِ بحث بناتے ہیں ناکام ہو چکے ہیں یا عنقریب ہو جائیں گے، کیونکہ یہ نظامہائے زندگی حقیقی صورتِ حال کے ادراک اور اس کے مطابق

Marfat.com

متوازن زندگی کے تصور سے محروم ہیں۔ اس محرومی کا نتیجہ فکری افلاس اور ناکامی کی صورت میں نکلتا ہے۔

انسان کا مقام متعین کرتے وقت ہمیں اسلامی احکام کو خدائی اخلاق کی نظر سے دیکھنا پڑتا ہے۔ خدائی اخلاق دراصل قرآن میں ذکر کردہ اخلاق ہیں۔ ہماری زندگی کا بنیادی مقصد لوگوں کو سرورِ کائنات حضرت محمد ﷺ کے اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دینا ہونا چاہیے اور کیا انسان کی تخلیق کا مقصد ہی اِس اعلیٰ اخلاق کا حصول نہیں ہے؟

اسلامی احکام کو بنیادی طور پر دو مجموعوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، جن کے لیے شاید سب سے جامع اور مختصر تعبیر 'نفسی اور آفاقی احکام' کی ہوسکتی ہے۔

پہلی قسم سے مراد ایسے اخلاق ہیں جنہیں روح کی تعمیر اور اصلاحِ باطن کے لئے اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے۔

دوسری قسم سے مراد ایسے اخلاق ہیں، جن کا تعلق خارجی دنیا سے ہوتا ہے۔

ہر انسان کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ استقامت کے ساتھ اپنی مخصوص روحانی زندگی گزارے۔ کسی انسان کے ارکانِ ایمان کا مدار اسی استقامت پر ہوتا ہے۔ یہ استقامت اللہ اور اس کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں، آخرت اور تقدیر پر ایمان رکھنے والے ہر شخص میں خاص مقدار میں بالفعل موجود ہوتی ہے۔ اس استقامت کو عبادات یعنی 'نیک اعمال' کے ذریعے مضبوط کرتے رہنا چاہیے، تاکہ یہ انسان کی فطرتِ ثانیہ بن کر اس کی زندگی کا لازمی حصہ بن جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان نہ صرف اسلامی احکام میں سے فرض عبادات مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کی پابندی کرتا ہے، بلکہ نوافل کے ذریعے اپنی روحانی زندگی کو تقویت پہنچاتا اور اپنی دنیا کو مزین کرتا ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ مذکورہ بالا احکام میں اوامر کو بجالانا اور منہیات سے بچنا دونوں داخل ہیں، گویا ان احکام کی ایک جانب جنت ہے تو ان کا دوسرا پہلو دوزخ ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان احکام کا ایک پہلو ثواب ہے تو دوسرا سزا، اس لئے احکامات کو بجالانا اور منہیات سے بچنا ہی متوازن زندگی ہے۔

آیئے اس مسئلے کو زمینی حقائق اور انسانی فطرت کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے

96915
Marfat.com

ہمیں مختلف قسم کی خوبیوں اور خامیوں کے مجموعے کی صورت میں پیدا کیا ہے۔ یہ خصوصیت کسی اور مخلوق میں نہیں پائی جاتی۔ جانور اپنی فطرتی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ قوتِ ارادی سے محروم ہونے کے باعث ان پر کسی قسم کی ذمہ داری بھی عائد نہیں کی گئی۔ صلاحیتوں کے اعتبار سے جنات بھی انسانوں سے بہت مختلف ہیں۔ شیاطین کی فطرت میں برائی اتنی غالب ہے کہ ان سے صرف برائی کا ہی صدور ہوتا ہے۔ فرشتوں کی صلاحیتیں بھی محدود ہیں۔ میں نے 'محدود' کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے کیونکہ انسانوں کے برعکس ان کے پاس کمال کے حصول کا کوئی ذریعہ نہیں۔ جس طرح فرشتے گناہوں سے معصوم ہیں اسی طرح شیاطین اطاعت کی بجا آوری سے محروم ہیں، لیکن حضرتِ انسان میں نیکی اور برائی کی صلاحیت برابر درجے میں موجود ہے، چنانچہ ایک طرف اس کے لئے 'أشرف المخلوقات' کے مرتبے پر فائز ہونا ممکن ہے تو دوسری طرف وہ 'أسفل السافلین' میں بھی گر سکتا ہے۔

دین اسلام اپنے احکام و اوامر کے ذریعے ہمیشہ برائیوں کا مکمل طور پر خاتمہ کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ مچھروں سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ گندگی کے جوہڑوں کو ختم کرنا ہے۔ اگر سانپ کو بڑا ہونے کا موقع دیا جائے تو قابو سے باہر ہو جانے کی صورت میں اس کا مقابلہ نہ کر سکنے کی شکایت کرنا بے سود ہے۔ ہمارے خیال میں اِس نقطہ نظر سے اسلامی احکام کا گہرائی سے مطالعہ کرنا مسائل کا زیادہ جامعیت کے ساتھ احاطہ کرنے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ ترغیب و ترہیب، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور ثواب و عذاب کا امتزاج اسلامی احکام کے اہداف و مقاصد کے حصول کے لیے وضع کردہ اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے۔ برائیوں اور ان کے اسباب پر سزا مقرر کرنا (گویا گندے جوہڑوں کو ختم کرنا) برائیوں کا مکمل طور پر ازالہ کرنے کی ایک کوشش ہے۔

اس کتاب میں ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ اپنی بحث کا آغاز ہم اس اصول سے کریں گے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام کا ایک اہم حکم ہے جو ہر مسلمان کا نصب العین ہونا چاہیے۔ اس حقیقت کے اعتراف سے ہمارے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس بحث کے نتیجے میں 'اسلام میں دعوت و تبلیغ کے اصولوں' کے بہت سے مخفی گوشے منظر عام پر آئیں گے۔

Marfat.com

Marfat.com

پہلی فصل

تبلیغ کا تعارف

۱۔ تبلیغ ہماری زندگی کا مقصد

۲۔ تبلیغ کی ضرورت اور اس کی اہلیت کی شرائط

۳۔ تبلیغ سب سے قیمتی تحفہ

۴۔ تبلیغ اور مستقل مزاجی

۵۔ خالق اور مخلوق کے اعتبار سے دعوت و تبلیغ کے مختلف پہلو

۶۔ دعوت و تبلیغ اور فرد و معاشرے کا باہمی تعلق

۷۔ دعوت، ایمان اور نفاق

۸۔ تاریخی واقعات کی روشنی میں دعوت و تبلیغ اور ہلاکت و بربادی

۹۔ دعوت و تبلیغ، نصرتِ دین کا پیمانہ

Marfat.com

Marfat.com

۱۔ تبلیغ ہماری زندگی کا مقصد

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، تخلیقِ کائنات کے مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ اسی عظیم اور جلیل القدر کام کی خاطر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کارخانہء کائنات کا نظام چلا کر حضرتِ انسان کو مسندِ خلافت پر بٹھایا اور انبیاء کا سلسلہ جاری فرمایا۔ حضرت آدم علیہ السلام روئے زمین پر پہلے انسان اور نبی تھے۔ اولادِ آدم نے آنکھ کھولتے ہی اپنے باپ کو نبی کی حیثیت سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے دیکھا، یوں انسانیت اور نبوت کا آغاز ایک ساتھ ہوا۔ سب سے آخر میں سید الکونین حضرت محمد ﷺ تشریف لائے، جنہیں کائنات میں سب سے پہلے پیدا کیا گیا اور انہیں کی خاطر نظامِ ہستی چلایا گیا۔ اس بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد تبلیغ اور دعوت الی اللہ تھا۔ دعوت وتبلیغ کی روح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، جس کی خاطر کائنات کو وجود میں لایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو کام کائنات کی تخلیق کا باعث ہے وہ یقیناً اہم ترین کام قرار پائے گا۔

حضرت آدم علیہ السلام ہمہ وقت عالم بالا کی طرف متوجہ رہتے، وہاں سے احکامات لیتے اور ان پر پوری طرح عمل پیرا ہوتے۔ خوف خدا کے باعث وہ کسی دوسری طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی اولاد کے لیے آفتابِ ہدایت ثابت ہوئے۔ وہ پہلے انسان اور نبی تھے، جنہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد یہ سلسلہ بند نہیں ہوا، بلکہ اولوالعزم انبیائے کرام نے اس سلسلے کو ان کے بعد بھی جاری رکھا۔ اس سلسلے کا جاری رہنا وقت کی ضرورت تھی، کیونکہ انسانی کمالات خواہ کتنے ہی بلند کیوں نہ ہوں، مرورِ ایام اور حوادثِ زمانہ کے زیر اثر انحطاط اور اضمحلال کا شکار ہوجاتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں بھی اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ کسی تجدیدی کوشش کے بغیر طویل زمانے کا گزرنا دلوں کی سختی کا باعث بن جاتا ہے۔ جب انسانیت کے سرچشمے سوکھ جائیں، نگاہیں بھٹک جائیں اور قدم ڈگمگانے

Marfat.com

لگیں تو انسانیت استقامت کھو بیٹھتی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسانی حالات کے بارے میں اپنے کامل علم اور اپنی بے پایاں رحمت کے پیش نظر پے در پے انبیائے کرام بھیجے اور ہر نبی کو حالاتِ زمانہ کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری سونپی۔

سیدنا آدم علیہ السلام نے اپنی تمام عمر اسی طریقے کے مطابق گزاری اور اپنی اولاد کو بھی ہمیشہ نیک کام کرنے اور برے کاموں سے بچنے کی وصیت کی۔ آپ علیہ السلام کی دعوت کی صدائے بازگشت کچھ عرصہ تک سنائی دیتی رہی، لیکن جب ان کی دعوت کے اثرات زائل ہونے لگے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نبوت کی ذمہ داری سیدنا آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے منتخب افراد کے کندھوں پر ڈال دی۔ ان میں سے ہر ایک اس جلیل القدر فریضے کو خوش اسلوبی سے ادا کرتا رہا۔ جوں ہی کسی نبی کے انتقال کے بعد دنیا میں تاریکی چھانے لگتی اللہ تعالیٰ کسی دوسرے نبی کو مبعوث فرما دیتے۔ انسانیت کے تاریک آسمان پر اولیائے کرام بھی ستاروں کی طرح ٹمٹماتے رہے، تاہم ان کی روشنی آفتابِ نبوت کی طرح تابناک نہ تھی۔

حضرت نوح علیہ السلام کے دور تک یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ایک اولوالعزم پیغمبر کی حیثیت سے انسانیت کو جو پیغام پہنچایا، قرآن کریم اسے درج ذیل الفاظ میں ذکر کرتا ہے: ﴿أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنْصَحُ لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ ”تمہیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور مجھے خدا کی طرف سے ایسی باتیں معلوم ہیں جن سے تم بے خبر ہو۔“ [الأعراف: ٦٢]

یعنی جو شخص میری بات سن کر میری اطاعت کرتے ہوئے میری کشتی میں سوار ہو جائے گا وہ ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے کامیاب و کامران ہوگا۔ پانی کی تلاطم خیز موجوں کو پہاڑ کی مانند چیرتی ہوئی کشتی تو تمہارے جسموں کو غرقاب ہونے سے بچائے گی، لیکن اگر تم نے دل و جان سے میری باتوں کو سن کر ان پر عمل کیا تو دنیا و آخرت کی ہولناکیوں سے بھی محفوظ رہو گے۔ ورنہ جسمانی اور روحانی، ظاہری اور باطنی طور پر اضمحلال کا شکار ہو کر معدوم ہو جاؤ گے۔

Marfat.com

حضرت نوح علیہ السلام نے اس اسلوب کے مطابق دعوت دیتے ہوئے اپنی عمر کے تقریباً ایک ہزار سال گزار دیے۔ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ان کا پیغام بھی قرآنِ کریم میں درج ذیل الفاظ میں محفوظ ہے: ﴿أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ﴾ ''میں تمہیں خدا کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہارا امانت دار خیر خواہ ہوں'' [الأعراف: ٦٨]

انہوں نے انسانیت کو اپنی تخلیق کے مقصد کے مطابق زندگی گزارنے کی دعوت دی۔انسان کو اس مقصد کی یاد دہانی کرانے کے لیے انبیائے کرام کا سلسلہ جاری رہا۔وہ مقصد یہ تھا کہ انسان نہ صرف اپنے رب کو پہچان کر اس پر ایمان لائے، بلکہ اسے اپنے وجدان میں بھی محسوس کرے۔ حضرت ہود علیہ السلام کے بعد بھی اللہ تعالیٰ جلیل القدر انبیائے کرام کو مبعوث کرتے رہے، جنہوں نے اسی راستے پر چلتے ہوئے اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی سرانجام دیا۔

جب کبھی گزشتہ نبی کی تعلیمات کے نقوش ذہنوں سے مٹ جاتے تو انسانیت گراوٹ کا شکار ہو جاتی۔اس کی روحانی زندگی کی عمارت متزلزل ہو جاتی، جس کے نتیجے میں زندگی بنجر اور مردہ زمین کی طرح ہو جاتی۔عالم بالا سے روح پرور بادِ صبا کے جھونکوں کا سلسلہ رُک جاتا اور انسانیت انحطاط کا شکار ہو کر بکھر جاتی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کے وقت انسانیت اسی قسم کی تاریکی میں بھٹک رہی تھی۔انہوں نے 'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' کے روح پرور جذبات کے ساتھ اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔وہ جہاں کہیں بھی چند لوگوں کا مجمع دیکھتے ان کے پاس جا کر انہیں اللہ کی طرف بلاتے اور ان تک حق بات پہنچاتے۔جنہوں نے ان کی بات کو غور سے سن کر ان کی تعلیمات کی پیروی کی وہ انسانی کمالات کی بلندیوں تک پہنچ گئے۔

لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد انسانیت دوبارہ زوال کا شکار ہو کر بلندی سے پستی کی طرف گرنے لگی۔ذہنوں پر مادی فکر کا غلبہ ہو گیا، جس کے نتیجے میں لوگ اپنی مشکلات کا حل مادی اشیاء میں تلاش کرنے لگے۔آج تک انسانیت اس مصیبت میں گرفتار ہے، بلکہ ہمیں اس کی ہلاکت خیزیوں اور انجامِ بد کا زیادہ مشاہدہ ہو رہا ہے۔

Marfat.com

حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر میں دریائے نیل کے کنارے اسی قسم کے مادہ پرستانہ معاشرے میں مبعوث ہوئے۔ اس قوم کے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت تھے۔ اپنے پیش رو بھائیوں کی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری سونپی گئی۔ آپ علیہ السلام نے اس مشکل فریضے کو قبول کر کے اپنی قوم کو دوبارہ بلندیوں کی طرف اٹھانا شروع کیا۔ کسی حد تک آپ علیہ السلام کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں۔ اگرچہ آپ کی مخاطب ایک ایسی قوم تھی، جس کی قیادت اور رہنمائی کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، لیکن آپ نے اپنی دعوت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جہدِ مسلسل کے بہت سے ثمرات کا اپنی زندگی میں ہی مشاہدہ کر لیا تھا۔

اس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ انسانیت کو بامِ عروج تک پہنچانا اور انسان کو انسانیت سکھانا کوئی آسان کام نہیں۔ بہت سے پیغمبروں کو اللہ کے راستے میں شہید کر دیا گیا۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو تیز آرے سے دو ٹکڑے کر دیا گیا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بھی جامِ شہادت نوش کرنا پڑا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے بھی صلیب اسی مقصد کے لیے نصب کی گئی تھی۔

اس سب کچھ کے باوجود نبی کریم ﷺ نے اللہ کے راستے میں سب سے زیادہ تکلیفیں اور مشقتیں اٹھائیں۔ تکلیف اور مشقت کی کوئی صنف ایسی نہیں جو آپ نے برداشت نہ کی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ سے فرمایا تھا:

"مجھے تمہاری قوم کی طرف سے بے انتہا تکلیفیں پہنچیں"۔ (۱)

یہ دراصل ایک غمگین پیغمبر کے دلِ شکستہ کی دکھی آواز ہے۔ اس کلام کو حضرت آدم علیہ السلام تک کے تمام انبیاء کرام کے سلسلے کے ساتھ جوڑیں اور چشمِ تصور میں اس کلام کا خیال کریں تو آپ کو ہر نبی کے دلِ شکستہ کی آواز سنائی دے گی۔ گویا حضرت آدم علیہ السلام اپنی اولاد کو جمع کر کے ان سے کہہ رہے ہیں: "تمہاری طرف سے مجھے بہت دکھ پہنچے ہیں"۔ حضرت نوح اور حضرت ہود علیہما السلام بھی یہی بات کہہ رہے ہیں اور دوسرے انبیائے کرام کی زبان پر بھی دکھ کی یہی کہانی ہے۔

---

(۱) بخاری: بدأ الخلق، ۵۷، مسلم: الجهاد والسیر: ۱۱۱

Marfat.com

رسول ﷺ کے بعد اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر اٹھانے والے خوش نصیبوں کی گفتگو میں بھی یہی انکسار جھلکتا ہوا نظر آتا ہے:

''میں نے اسّی برس سے متجاوز اپنی عمر میں کبھی دنیا کی کسی لذت کا مزا نہیں چکھا۔ میری زندگی جنگ کے میدانوں، جیل کی کوٹھڑیوں اور عدالتوں میں گزری، تکلیف اور مصیبت کی کوئی صنف ایسی نہ ہوگی جس کا میں نے سامنا نہ کیا ہو۔ فوجی عدالتوں میں میرے ساتھ قاتلوں جیسا سلوک کیا گیا، مجھے ملک کے بہت سے حصوں سے جلاوطن کیا گیا، مہینوں مجھے کال کوٹھڑیوں میں بند کر کے لوگوں سے ملنے جلنے سے محروم رکھا گیا۔ مجھے کئی دفعہ زہر دیا گیا اور طرح طرح کا ذلت آمیز سلوک کیا گیا۔ میری زندگی میں بعض لمحات ایسے بھی آئے کہ جن میں میں موت کو زندگی پر ہزار درجے زیادہ ترجیح دیتا تھا۔ اگر میرے دین میں خودکشی حرام نہ ہوتی تو شاید سعید اب منوں مٹی تلے ہوتا۔''(1)

مذکورہ بالا تحریر دراصل دل میں چھپے ہوئے حزن والم کی عکاس ہے۔ انہوں نے شاید اس تحریر کے ذریعے تمام شکستہ دل عظیم لوگوں کی ترجمانی کی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے والے ہر شخص کے مقدر میں یہی داستان ہے۔

اس مسئلہ کی اہمیت اور عموم کے احساس کی وجہ سے میں نے تمہارے فکر کے ساز کی تاروں کو چھیڑنے کا ارادہ کیا ہے، تاکہ تم تمام انبیائے کرام علیہم السلام خصوصاً حضرت آدم علیہ السلام اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان اتصال کا ادراک کرسکو۔ میرے احساسات کی شدت اس مسئلے کے تقدس کی وجہ سے ہے۔ میں اپنے خیالات کی دنیا میں ان بابرکت اور حق پرست شخصیات کا ذکر سنتا اور محسوس کرتا رہتا ہوں۔

انسان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے راستے میں جو قدم بھی اٹھاتا ہے وہ اس کے لئے وراثتِ نبوت کے ثواب کا باعث بن جاتا ہے، کیونکہ یہ بنیادی طور پر انبیائے کرام کا کام ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اس مقصد کے لیے کوئی اقدام کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اس مہتم

(1) بدیع الزمان سعید نورسی کی سوانح ص: ۴۵۷

Marfat.com

بالشان ذمہ داری کو قبول کرلیا ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اسے یہ ذمہ داری سونپی ہے، بالفاظ دیگر ایسے شخص کو اس کی نیت اور درجے کے مطابق اس ذمہ داری کا اجر وثواب ملتا ہے۔

یہاں ایک دوسرے نکتے کی طرف اشارہ کردینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ چونکہ یہ انبیائے کرام کا کام ہے، جو سب کے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطلوب صراطِ مستقیم پر قائم تھے اس لیے جو لوگ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری اٹھائیں گے، وہ بھی کم از کم اس فریضے کی ادائیگی کی حد تک یقیناً درست راستے پر ہوں گے۔

حاصل یہ کہ اپنے آپ کو مومن کی حیثیت سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت دلانے اور اپنے ایمان کی بقا کی خاطر ہر مومن کے لئے ضروری ہے کہ دعوت وتبلیغ کے فریضے کو کما حقہ ادا کرے، کیونکہ مذکورہ بالا دونوں باتوں میں گہرا تعلق پایا جاتا ہے، لہٰذا فرد اور معاشرہ اس فریضے کو کما حقہ ادا کیے بغیر نہ تو اپنے وجود کو برقرار رکھ سکتا ہے اور نہ ہی اسے دوام بخش سکتا ہے۔

حقیقی ایمان اور اس کی بقا کے لیے درج ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:

(۱) اپنی زندگی میں صرف حق بات کی پیروری کرے۔

(۲) ظلم کے خلاف گونگے شیطان کی طرح خاموش تماشائی نہ بنا رہے۔

(۳) زندگی اور موت کی پرواہ نہ کرے۔

(۴) ہمیشہ صحابہ کرام کے وضع کردہ مفاہیم کے دائرے میں رہے۔

(۵) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھے۔

مذکورہ بالا امور کے بغیر زندگی بالکل ہی بے فائدہ ہے۔ ہر مومن کو چاہیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی پناہ میں آجائے اور ایسے معاشرے سے خدا کی پناہ مانگتا رہے جو مذکورہ بالا امور سے تہی دامن ہو۔

انسان جن افکار پر ایمان رکھتا ہے اور ان کی خاطر قربانیاں پیش کرتا ہے، اس فریضے کی ادائیگی کے دوران انہیں اپنی زندگی میں عملی طور پر لاسکتا ہے۔ ایمان کبھی بے ثمر ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ حقیقی اسلام تو وہ ہے جس کے مطابق انسان کی زندگی گزرتی ہے۔ جب تک اسلام کے مطابق اپنی زندگیوں کو نہ ڈھالا جائے اس وقت تک اسلام کا صحیح فہم حاصل نہیں ہوسکتا، جو انسان ایمان اور دعوت

Marfat.com

کو ہر چیز کا مرکز قرار دیتا ہے، وہ اپنی زندگی کی تمام سرگرمیوں کو اس کے تابع بناتا ہے۔ جن پانچ بنیادی امور کی حفاظت کرنا ہر مومن پر ضروری ہے، ان میں سے سب سے پہلی چیز دین ہے۔[1] انسان یقیناً اپنی عزت، مال، زندگی، نسل اور عقل کی حفاظت کرتا ہے، لیکن ان سب سے بڑھ کر اپنے دین کی حفاظت کرنا ضروری ہے، اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اپنے دین کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ انسان کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کے بارے میں بہترین کسوٹی یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ اپنے ایمان کی حفاظت کے بارے میں کتنی جدوجہد اور غیرت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ جو شخص اپنے دین کی حفاظت نہیں کرتا وہ باقی چار بنیادی امور کی حفاظت بھی نہیں کر پاتا۔ شاید تاریخ کا سب سے عبرت آموز اور تصدیق شدہ سبق ہے۔

ہماری پیدائش کا مقصد اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا اور دوسروں کے دلوں کو معرفت خداوندی سے منور کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی منشا کے مطابق زندگی بسر کرنا ہی ہماری دنیا و آخرت کی کامیابی کا ضامن ہے۔ منشائے خداوندی کے خلاف زندگی گزارنے کی صورت میں ہمیں امت اور معاشرے کی حیثیت سے سزا کا سامنا کرنا پڑے گا، نیز (العیاذ باللہ) فتنوں اور فسادات کی دلدل میں پھنس جائیں گے، یعنی اگر تبلیغ کے اس جلیل القدر فریضے کو ادا نہ کیا گیا تو معاشرے کو مختلف قسم کے مصائب اور حوادث کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک دن صحابہ کرام نبی اکرم ﷺ کے گرد حلقہ بنا کر غور سے آپ ﷺ کے ارشادات سن رہے تھے کہ آپ ﷺ نے اس بارے میں اپنی پاکیزہ زبان سے جس سے ہمیشہ لعل و گوہر جھڑتے تھے بڑے تہدیدی انداز میں بعض باتیں ارشاد فرمائیں۔ چنانچہ ابو یعلیٰ اور ابن ابی الدنیا نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! اُس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی جب تمہاری عورتیں نافرمان اور تمہاری اولاد فاسق ہو جائے گی؟'' صحابہ کرام نے عرض کیا: ''کیا ایسا بھی ہوگا؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں! بلکہ اس سے بھی بدتر صورتِ حال پیش آئے گی۔ اُس وقت تمہاری کیا صورتِ حال ہوگی جب تم امر بالمعروف

---

(۱) پانچ بنیادی امور میں دین، عقل، نسل، مال اور جان شامل ہیں۔

Marfat.com

اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دو گے؟" صحابہ کرام نے عرض کیا: "کیا ایسا بھی ہوگا؟" آپ نے ارشاد فرمایا: "ہاں! جب تم برائی کو نیکی اور نیکی کو برائی سمجھنے لگو گے تو یہ اس سے بھی بدتر صورت حال ہوگی۔"(۱)

صحابہ کرامؓ یہ بات سن کر حیران و پریشان ہوگئے۔ یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر تھی، اس چونکہ انہیں یقین تھا کہ اس قسم کے فتنے کسی معاشرے میں اس وقت تک پیش نہیں آسکتے جب تک ان میں کوئی ایک بھی مومن موجود ہو، اس لیے انہوں نے پوچھا: "اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا ایسا بھی ہو گا؟" انہوں نے یہ بات استفسار اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہی تھی اور جب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اس سے بھی بدتر صورتِ حال پیش آئے گی۔" تو ایک عجیب وغریب فضا قائم ہوگئی اور آنکھیں پتھرا گئیں۔ صحابہ کرام نے ایک بار پھر شدید حیرت سے استفسار کیا: "اے اللہ کے رسول ﷺ! اس سے بھی بدتر صورتِ حال کیا ہے؟" تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اس وقت تمہاری کیا صورتِ حال ہوگی جب تم بُرائی کو نیکی اور نیکی کو بُرائی سمجھنے لگو گے؟" اس حدیث مبارک کا یہ جملہ مسلمانوں کی موجودہ صورتِ حال کا غماز ہے۔ حدیث مبارک میں اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ عنقریب تمام اقدار اور معیار بدل جائیں گے۔ بُرائی کو نیکی اور نیکی کو بُرائی سمجھا جانے لگے گا۔ بے حیائی پھیل جائے گی۔ انتشار اور دہشت کا دور دورہ ہوگا۔ ایمان اور قرآن کی عظمت دلوں سے نکل جائے گی۔ اہل ایمان کو ذلیل سمجھا جائے گا۔ حکومتیں قوانین کے ذریعے بہت سی بُرائیوں کو تحفظ فراہم کریں گی اور دینی احکام کو پس ماندگی اور رجعت پسندی کا سبب قرار دیا جانے لگے گا۔ اسے اقدار اور معیار کا معکوس ہونا کہتے ہیں۔ دورِ حاضر کا انسان ان فتنوں کا کئی گنا زیادتی کے ساتھ سامنا کر رہا ہے اور میرے خیال میں آئندہ بھی کافی عرصے تک یہ صورتِ حال برقرار رہے گی۔ جب تک تبلیغ کے فریضے کو ادا نہ کیا گیا اس وقت تک عزت وشرف کی جگہ ذلت اور پستی مسلمانوں کا مقدر بنی رہے گی۔

---

(۱) ابو یعلیٰ، المسند: ۱۱/ ۳۰۴، الهيثمي: مجمع الزوائد: ۷/ ۲۸۰۔ ۲۸۱

Marfat.com

اہل خرد جانتے ہیں کہ جب فطرت کے قوانین کو توڑا جائے تو بُرے نتائج اور انجام کا ہر صورت میں سامنا کرنا پڑتا ہے۔ روزِ اول سے دنیا کا یہ اصول چلا آ رہا ہے۔ اسی وجہ سے صحابہ کرامؓ نے حیرت سے ایک مرتبہ پھر استفسار کیا: ''اے اللہ کے رسول! کیا یہ بات یقیناً پیش آئے گی؟'' یعنی کیا بدی کا حکم دیا جائے گا اور نیکی سے روکا جائے گا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں! بلکہ اس سے بھی سنگین صورتِ حال پیش آئے گی، تمہاری اس وقت کیا صورتِ حال ہوگی جب تم بدی کا حکم کرو گے اور نیکی سے روکو گے؟'' یعنی تم اپنے اہل و عیال کو کھلی چھوٹ دے دو گے، جس کے نتیجے میں وہ معاصی کے سیلاب میں بہہ جائیں گے۔ یہ ایسی صورتِ حال ہوگی کہ جس میں تم اپنے افعال، کردار اور حالات کے ذریعے انہیں بُرائیوں کے ارتکاب کی دعوت دو گے اور ان کے دلوں سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی یاد بھلا دینے کا سبب بنو گے۔ وہ دن تمہارے لیے بڑا ہلاکت خیز ہوگا۔

یہ بات سن کر صحابہ کرامؓ حیرت اور خوف کی انتہا کو پہنچ گئے اور انہوں نے لڑکھڑاتی زبان سے پھر سوال کیا: ''اے اللہ کے رسول کیا واقعی ایسا ہوگا؟'' تو آپ نے جواباً ارشاد فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اس سے بھی زیادہ سنگین صورتِ حال پیش آئے گی'' اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

> ''وہ فتنے اندھیری رات کے ٹکڑوں کی طرح پے در پے تم پر نازل ہوں گے اور ان میں اتنی گہری مشابہت ہوگی کہ تم ان میں فرق نہ کر سکو گے۔''(۱)

مذکورہ بالا حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ نے انتہائی اعجاز کے ساتھ اس جلیل القدر فریضے کی اہمیت کا ادراک نہ کرنے کے انجامِ بد سے اپنی امت کو آگاہ فرمایا ہے۔ درحقیقت یہ فریضہ سب پر عائد ہوتا ہے۔ ہمارے دلوں پر پچھلی تین صدیوں سے گناہوں کی دبیز تہیں جم چکی ہیں، جنہیں زائل کرنے کی صرف یہی صورت ہے کہ امت کو اس فریضے کی اہمیت اور ادائیگی کا احساس دلائیں، جسے انبیائے کرام ادا کیا کرتے تھے۔

---

(۱) مسند أحمد: ۲۲۲۳۹، مسند الأنصار

Marfat.com

۲- تبلیغ کی ضرورت اور اس کی اہلیت کی شرائط

آج کے انسان کو پہلے زمانے کے کسی بھی انسان سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی زیادہ ضرورت ہے۔ نبوت کا سلسلہ خاتم الرسل جناب نبی کریم ﷺ پر ختم ہو چکا ہے۔ اس کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے، جبکہ دوسری طرف دورِ حاضر میں کفر اور معصیت کا طوفان ماضی کی بہ نسبت کہیں زیادہ شدت سے برپا ہے، اس لیے آج کے دور میں اس عظیم فریضے کو سرانجام دینے والوں کو گزشتہ تمام زمانوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ مشقتوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن موجودہ کٹھن حالات ہی آج کے مبلغین اور راہنماؤں کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ اپنے سے پہلے لوگوں پر اپنی فوقیت ثابت اور صحابہ کرامؓ سے صرف ایک درجہ نیچے کے لوگوں میں اپنا نام رقم کریں۔

نفس ہر شے سے ادنیٰ اور یہ فریضہ ہر شے سے اعلیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت انسانوں کی طرف ان کی صلاحیتوں کی برعکس نسبت سے متوجہ ہوتی ہے۔ چنانچہ جو آدمی جتنا کمزور اور بے بس ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر اتنا ہی زیادہ مہربان ہوتے ہیں۔

مختلف قسم کے نقطہ ہائے نظر کے سبب پیدا ہونے والے گناہ اور ان کے ذہنوں پر نقش ہو جانے والے اثرات ہمارے دلوں کی گہرائیوں تک راہ پا چکے ہیں، جس کی وجہ سے ہمارے اعضاء ایک طرح سے ماؤف ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری راتیں شوق و محبت کے جذبات اور ہمارے محراب خوفِ خدا کے آنسوؤں سے محروم ہیں۔ عشق و محبت سے خالی جسم کی مانند ہمارے حالات کی وجہ سے ہم پر کوئی بھی بڑی مصیبت آسکتی ہے، جس کی سب سے خطرناک صورت (العیاذ باللہ) اللہ کی رحمت سے دوری ہے، جس کا شکار شیطان بھی ہو چکا ہے۔

ہم بیسویں صدی کے مسلمان صبح و شام گناہوں میں لت پت رہتے ہیں۔ اگر ہماری آنکھوں سے غفلت کا پردہ اٹھ جاتا اور ہم اپنی روحانی حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے تو ہم اپنی موجودہ حالت سے سب سے پہلے راہِ فرار اختیار کرتے۔

ہمارے گناہوں کی کثرت اور تنزل وانحطاط کے باوجود اللہ تعالیٰ کا امر بالمعروف اور نہی

Marfat.com

عن المنکر کی ذمہ داری ہمیں سونپنا اس بات کی دلیل ہے کہ ہم اس کی رحمت کے انتہائی محتاج ہیں۔ ہماری کمزوری اور بے بسی کی کوئی انتہا نہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عظمت اور وسعتِ رحمت کا کوئی منتہا نہیں۔ اگر ہم اپنے دلی جذبات کا اظہار ہزار بار الحمدللہ کہہ کر کریں تب بھی یہ اس کی بے پایاں رحمت کے مقابلے میں ہیچ ہے۔

بیسویں صدی عیسوی ہر شعبے میں معنوی اور روحانی اعتبار سے زوال اور انحطاط کی صدی ہے۔ اس دور میں لوگوں کی نظریں بہک گئیں، آنکھوں پر پردے پڑ گئے، ہمتیں پست ہو گئیں اور منبر ومحراب کی پاکیزگی کے حامل لوگوں کے ہاتھ سے زمامِ اقتدار نکل گئی، لیکن ایسے ناموافق حالات میں بھی سید المرسلین ﷺ کی دعوت کے آثار اگرچہ کم ہیں مگر محسوس ہو رہے ہیں۔ صدیوں پہلے آپ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ کی صدائے بازگشت زمان ومکان کی حدود عبور کر کے ہم تک پہنچ رہی ہے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کی بے پناہ رحمت ہے، جس کا شکر ہم پر واجب ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہم آپ ﷺ کے حیات بخش انفاسِ طیبہ سے اپنی روحوں کو تروتازہ رکھیں اور انہیں حرزِ جان بنالیں۔ جو لوگ اس طرح شکر ادا کرتے ہیں وہ آخر کار کامیاب وسرفراز ہو جاتے ہیں۔ شیخ سعدی شیرازی فرماتے ہیں:

اس امت کو کیا غم لاحق ہو سکتا ہے
جس کے معاون و مددگار آپ ہوں
جس کشتی کے ناخدا حضرت نوح ہوں
اسے سمندر کی تلاطم خیز موجوں کا کیا خوف [1]

ہم ایسے سفینہ نجات میں سفر کر رہے ہیں جس کے ناخدا سید المرسلین ﷺ ہیں، جو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں: ”صرف وہی شخص نجات پائے گا جو میری کشتی میں سوار ہوگا۔“

کیا ہم سب کو بیک زبان ہو کر اس ندا پر لبیک نہیں کہنا چاہیے؟

---

(۱) گلستان سعدی شیرازی، روضۃ الورد، ترجمہ: محمد الفراتی ص:۹

Marfat.com

ذیل میں ہم ان آیات مبارکہ پر روشنی ڈالیں گے جن میں تبلیغِ دین ایک مسلمان کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے اور اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی ادا کرنے پر دنیوی و اُخروی ثواب کا ذکر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ"

"اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے۔ یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں۔" [آل عمران: ۳: ۱۰۴]

یعنی تم میں ہمیشہ ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے، جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتی رہے۔ لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، برائی سے دور کرے، انہیں نیکی کا راستہ بتائے، ان کے لیے سچائی اور استقامت کا نمونہ بنے اور خود بھی برائیوں سے ایسے بچے جیسے سانپ اور بچھو سے بچا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس جماعت کا ہر ہر فرد معاشرے میں قطبی ستارے کی مانند بن جائے، جس سے معاشرتی زندگی کی کشتی رہنمائی حاصل کرتی ہوئی درست راستے پر گامزن رہے۔ قیادت اور ذمہ داریاں اسی جماعت کے مشورے سے تقسیم کی جائیں۔ ایسی صورت میں بے راہ روی اور انحطاط ممکن حد تک کم سے کم ہو جائے گا۔ قائدانہ صلاحیتوں کی حامل اِس جماعت کی دعوتی فریضے کے ساتھ اس حد تک وابستگی ہونی چاہیے کہ یہ اُس کی پہچان بن جائے اور وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پیکرِ مجسّم بن جائے۔ ایسی صورت میں لوگ اُس پر اعتماد اور بھروسہ کرنے لگیں گے۔ اگر کسی معاشرے میں مذکورہ بالا صفات کی حامل جماعت نہیں تو اس کا اللہ ہی حافظ ہے۔ جب تک اُس میں ایسی جماعت تیار نہیں ہوگی اس وقت تک اس کی درستی و اصلاح کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔

اس کے برعکس جس معاشرے میں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے والی جماعت موجود ہوگی، اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہر قسم کی آسمانی اور زمینی مصیبتوں سے اس کی حفاظت کے ضامن ہوں گے۔ یہ ضمانت صرف اللہ تعالیٰ دے سکتے ہیں، چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

Marfat.com

''وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصلِحُونَ''

[هود:١١٧]

''اور تمہارا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو جبکہ وہاں کے باشندے نیکوکار ہوں از راہِ ظلم تباہ کردے۔''

قرآنِ کریم اور تمام انبیاء اور اولیائے کرام کے اقوال کی روشنی میں میں کہتا ہوں کہ جہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کیا جاتا ہو وہاں اللہ تعالیٰ کوئی بڑی مصیبت نازل نہیں فرماتے، بلکہ اگر وہ معاشرہ کسی وجہ سے سزا کا مستحق بھی ہو تب بھی اللہ تعالیٰ اُس جماعت کی وجہ سے اُس معاشرے سے عذاب ٹال دیتے ہیں، کیونکہ اس جماعت کے دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدت سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ان کی تمام عمر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں گزرتی ہے۔ ان کا ہر لمحہ خوف واضطراب میں گزرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس فریضے کی ادائیگی کا احساس ان پر اس قدر غالب آجاتا ہے کہ کھانے، پینے، سونے اور جاگنے غرض ہر وقت وہ اسی خیال میں مگن رہتے ہیں کہ اِس دین کو کب، کیسے اور کن لوگوں تک پہنچائیں؟ گویا یہ کیفیت ان کے وجود کا راز ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے جنہوں نے اپنی زندگیاں خدا کے لیے وقف کر رکھی ہیں، کسی معاشرے میں موجود رہیں گے اُس وقت تک وہ معاشرہ زمینی اور آسمانی بلاؤں اور آفتوں سے محفوظ رہے گا۔ اس لئے اگر ہم زمینی اور آسمانی مصائب سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں فوراً اُس فریضے کی ادائیگی کی طرف آنا ہوگا، جس کی خاطر ہماری تخلیق عمل میں آئی۔ ہمیں اِس بات پر پورا یقین رکھنا چاہیے کہ جو بھی مصیبت نازل ہوتی ہے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کرنے کی وجہ سے نازل ہوتی ہے۔ اگر ہم ان مصائب وآلام سے اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہیں تو اس کا صرف ایک ہی راستہ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی ہے۔ کسی اور عبادت میں یہ خاصیت موجود نہیں۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ ایسے شخص، جماعت یا پوری قوم کو ہلاک یا زمین میں دھنسا دیتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے ذکر و عبادت اور تلاوتِ قرآنِ کریم میں رات دن مشغول اور بیت اللہ کا طواف کر رہی ہوتی ہے، لیکن اگر وہ شخص، جماعت یا قوم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو ادا کر رہی ہو اور اِس کے بارے میں فکر مند ہو تو اللہ تعالیٰ اُس شہر اور اُس کے باشندوں کو تباہی و بربادی سے محفوظ رکھتے ہیں۔

Marfat.com

یہی وجہ ہے کہ بعض اسرائیلی روایات میں ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کو تباہ و برباد کیا اس وقت اُس میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے زاہد و عابد تھے، جو راتوں کو قیام کرتے اور دن بھر روزہ رکھتے تھے، لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم (أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ) میں اس کی تباہی و بربادی کے وقت نہ جانے کتنے لوگ راتوں کو عبادت کرنے اور دن کو روزہ رکھنے والے موجود ہوں گے۔

اس کے برعکس تاریخ میں ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی کہ کسی ایسی قوم کو ہلاک کر دیا گیا ہو، جس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے لوگ موجود ہوں۔ اس مسئلے پر ہم مزید روشنی اس بارے میں وارد آیات مبارکہ اور احادیث نبویہ پر کرتے ہوئے ڈالیں بحث کریں گے۔

ہم دعوت و تبلیغ کی حقیقت اور اس کی ضرورت کا اندازہ درج ذیل پہلو سے بھی لگا سکتے ہیں:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر روئے زمین پر انسان کے منصب خلافت کا تقاضا ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ انسان کو اشیاء میں تصرفات کرنے کی قدرت دی ہے، نیز اپنی صفت ارادہ میں سے اسے حصہ عطا کر کے اسے زمین کی خلافت کی صورت میں بلند مقام عطا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مخلوقات میں سے صرف انسان میں 'انانیت' پائی جاتی ہے۔ اسی 'انانیت' اور دیگر خداداد صلاحیتوں کے ذریعے انسان اپنی ذات و شخصیت کی حقیقت کا ادراک کر سکتا ہے، جس کا طریق کار یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور مختلف صفات کی حامل تجلّیات کی معرفت حاصل کرے، کیونکہ 'انانیت' کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسان کو حقِ ملکیت اور آزادی کا احساس دلاتی ہے۔ اس کے ذریعے انسان اپنے مالک و پروردگار کی عظیم اور مطلق صفات کی بہ نسبت اپنی محدود ملکیت اور صلاحیتوں کے فرضی خطوط کھینچ کر اس کی قدرتِ کاملہ کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا انسان کو مذکورہ بالا خصوصیت سے سرفراز کرنا اسے روزِ اول سے اپنے خلیفہ کے طور پر منتخب کرنے کے مترادف تھا۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے ساتھ ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ "میں زمین میں (اپنا) نائب بنانے والا ہوں" [البقرۃ: ۳۰] والی گفتگو کے بعد پیدا فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اشیاء

Marfat.com

میں تصرف کرنے کا اختیار دے کر دنیا میں اپنا خلیفہ نامزد کیا۔ خلیفہ کو اپنے خلیفہ بنانے والے کی طرف سے متعین کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں حدود سے مراد انبیائے کرام پر نازل ہونے والے خدائی احکام ہیں۔ ان احکامِ خداوندی کے مقتضا پر عمل پیرا ہو کر ہی خلافت کے فریضے کو بحسن و خوبی سرانجام دیا جا سکتا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ سے مرسلاً مروی حدیث سے اس مضمون کی مزید وضاحت یوں ہوتی ہے:

"مَنْ أَمَرَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهىٰ عَنِ الْمُنْكَرِ هُوَ خَلِيفَةُ فِي الْأَرْضِ وَخَلِيفَةُ كِتَابِهِ وَخَلِيفَةُ رَسُولِهِ"

"جو شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے دراصل وہی روئے زمین پر اللہ، اس کے رسول ﷺ اور اس کی کتاب کا خلیفہ ہے۔"(1)

ہر انسان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ خود بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت حاصل کرے اور دوسروں کے دلوں کو بھی معرفت خداوندی سے منور کرے، نیز اس کے کردار اور حالات سے یہ ظاہر ہو کہ اس کا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ ہر انسان پر اللہ کے رسول ﷺ اور اس کی نازل کردہ کتاب کی معرفت حاصل کرنا اور دوسروں تک اس کی معرفت پہنچانا ضروری ہے، نیز اپنی زندگی کو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے سانچے میں ڈھالنا بھی اِس فریضے میں شامل ہے۔ یہ فریضہ ہی انسان کی زندگی کا مقصد ہے، چنانچہ انسان جس قدر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے گا اسی قدر اپنے فریضے کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی حاصل کرنے کا ایک انتہائی اہم ذریعہ ہے۔

حضرت درّہ بنت ابی لہبؓ سے مروی ہے کہا یک مرتبہ نبی کریم ﷺ منبر پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک آدمی نے اُٹھ کر سوال کیا "یا رسول اللہ سب سے بہترین شخص کون ہے؟ آپ ﷺ

(1) الدیلمی، الفردوس: ۵۸۶/۳

Marfat.com

ارشاد فرمایا: ''لوگوں میں سے سب سے بہتر شخص وہ ہے جو سب سے زیادہ قرآن پڑھنے والا، سب سے زیادہ متقی، سب سے زیادہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والا اور سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والا ہو۔''(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ بہترین شخص وہ ہے جو رات دن امر بالمعروف کرنے اور خیر کی باتیں پھیلانے میں لگا رہتا ہے، وہ بدی سے روکتا ہے اور جرائم کے انسداد کے لیے اپنی تمام تر توانائی صرف کر دیتا ہے، وہ حق سبحانہ وتعالیٰ سے ڈرتا رہتا ہے اور اپنی زندگی کو قرآن کریم اور شریعت مطہرہ کے احکام کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے، وہ مخلوق پر شفقت اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہے۔ مذکورہ بالا امور انسان کے اہم ترین فرائض ہیں۔

اگر ہم واقعی دورِ حاضر کے انسان کے ساتھ تعلق قائم کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے دل میں اس کے لیے رحمت اور شفقت کے جذبات رکھتے ہیں تو اس کا مضبوط ترین ثبوت یہ ہوگا کہ ہم اپنے ذمہ فرض اس کے حقوق ادا کریں۔ سب سے اہم حق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے اوپر لازم پوری انسانیت کے اِس حق کی ادائیگی کے لیے سنجیدہ کوششیں کرتے رہنا چاہیے۔

جو شخص بھی اس فریضے کو سرانجام دے گا وہ درج ذیل آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ تعریف وتوصیف کا مستحق قرار پائے گا:

'' لَيۡسُوا سَوَاءً مِن أَهۡلِ الكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتۡلُونَ آيَاتِ اللّٰهِ آنَاءَ اللَّيۡلِ وَهُمۡ يَسۡجُدُونَ يُؤۡمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الآخِرِ وَيَأۡمُرُونَ بِالۡمَعۡرُوفِ وَ يَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الۡخَيۡرَاتِ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ''

''یہ بھی سب ایک جیسے نہیں ہیں، ان اہل کتاب میں کچھ لوگ (حکم خدا پر) قائم بھی ہیں، جو رات کے وقت خدا کی آیتیں پڑھتے ہیں اور (اس کے آگے) سجدے کرتے ہیں (اور) خدا پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے اور اچھے کام کرنے کو کہتے اور بری باتوں سے منع کرتے اور نیکیوں پر لپکتے ہیں اور یہی لوگ نیکوکار ہیں۔'' [آل عمران:۱۱۳۔۱۱۴]

(۱) المسند:۶/۴۳۲، البیہقی: شعب الایمان:۶/۲۲۰

Marfat.com

یعنی اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والا کوئی بھی شخص اگر اس فریضے کو ادا کرے گا تو وہ قرآن حکیم کی مذکورہ بالا تعریف کا مستحق ٹھہرے۔ کیا اس قسم کی آیات بھی ہمارے خیالات کی بلندی کا باعث نہیں بنتیں؟

دورِ حاضر میں انسانیت سنگدلی، تشدد، مار پیٹ اور قتل و غارت گری کی بجائے محبت، شفقت، نرم کلامی اور اُنس و محبت سے بھری گفتگو کی زیادہ ضرورت مند ہے۔ آج پوری انسانیت رحمت و شفقت کی طلب گار ہے۔ آپ کے دل میں انسانیت کا درد ہونا چاہیے۔ اُس کے قلق و اضطراب کا آپ کو اِس قدر احساس ہونا چاہیے کہ اُس کی غمی اور خوشی آپ کو اپنی غمی اور خوشی محسوس ہو۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ اہم کام سرانجام پا جائے گا جس کی انسانیت منتظر ہے۔

دورِ حاضر میں مشرق و مغرب میں حیرت انگیز تعداد میں لوگ ہدایت پا کر اسلام قبول کر رہے ہیں، نیز ملک کے اندر اور باہر لوگ پھر سے دین کی طرف بڑی تیزی سے لوٹ رہے ہیں۔ مساجد جنہیں کل تک اجتماعی زندگی سے خارج کر دیا گیا تھا آج پھر زندگی کا لازمی حصہ بن چکی ہیں۔ ساری دنیا میں یہی صورت حال بڑی تیزی سے پیدا ہو رہی ہے۔ اگر یہ بات دورِ حاضر میں کوئی اہمیت رکھتی ہے اور یقیناً اہمیت رکھتی ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں کے دلوں پر شفقت و محبت سے اثر انداز ہوا جا سکتا ہے، نیز بغض و عداوت کا باعث بننے والی باتوں سے نہ تو ماضی میں کبھی فائدہ پہنچا ہے اور نہ ہی دورِ حاضر یا مستقبل میں اس کی امید کی جا سکتی ہے۔

میں کتنے ہی ایسے افراد کو جانتا ہوں جو حال ہی میں ایمان لائے ہیں۔ اگر وہ کچھ عرصہ پہلے قتل کر دیئے جاتے تو آج وہ ایمان کے روحانی ثمرات سے محروم ہوتے۔ وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہم ملک میں بدامنی اور انتشار کے زمانے میں مدِ مقابل جماعت کے ایک فرد کی حیثیت سے قتل نہیں کر دیئے گئے، ورنہ ہم دنیا اور آخرت دونوں میں خسارے میں رہتے۔

ایک صحابی نے جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے ایک دوسرے صحابی کو جو انہیں زمانہ جاہلیت میں نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی کو قتل کرنے پر ملامت کر رہے تھے، مخاطب کر کے بڑی

Marfat.com

پر مغزبات کہی تھی کہ تم مجھے میرے اِس عمل پر ملامت کر رہے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسے میرے ہاتھ سے شہادت نصیب کر کے جنت میں داخل کر دیا ہے، لیکن اگر میں کفر کی حالت اُس کے ہاتھوں قتل ہو جاتا تو میرا کیا بنتا؟ جہنم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرا مقدر بن جاتی۔

آپ بھی اگر کسی ایسے شخص کی طرف متوجہ ہوں، جس نے بدامنی اور انتشار کے فتنے سے نجات پا کر ہدایت پائی اور نمازوں کا پابند ہو گیا تو آپ کو بھی اِسی قسم کی گفتگو سننے کو ملے گی۔ میں بڑی شدت سے ایسے لوگوں کی رائے جاننے کا خواہش مند رہتا ہوں، جو معاملات کے حل کے لئے طاقت کے استعمال کو درست سمجھتے ہیں کہ اگر وہ سابقہ مجرموں کو آج نمازوں میں خشوع و خضوع کے ساتھ روتا ہوا دیکھیں تو اُن کے کیا تاثرات ہوں گے؟

میں اس سلسلے کی ایک عمدہ مثال خیر القرون سے پیش کرنا چاہوں گا: حضرت عمرو بن عاصؓ نے بڑی لمبی اور مبارک عمر پائی۔ آپ بڑے نڈر، مدبر اور آزمودہ کار انسان تھے۔ موت کے وقت آپ بڑے بے چین تھے اور دیوار کی طرف منہ کر کے رونے لگے۔ آپ کے بیٹے عبداللہ بن عمروؓ جو ایک جلیل القدر عالم تھے، آپ سے کہنے لگے: ''ابا جان کیا رسول اللہ ﷺ نے آپ کو فلاں فلاں خوش خبریاں نہیں دی ہیں؟ پھر آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟''

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''ہم سب سے بہترین چیز اس بات کی گواہی کو سمجھتے تھے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ مجھ پر تین طرح کے ادوار گزرے ہیں: ''ایک وہ دور جب رسول اللہ ﷺ سے زیادہ مجھے کسی شخص سے نفرت نہیں تھی اور میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ مجھے موقع ملے اور میں آپ ﷺ کو قتل کر دوں۔ اگر مجھے اِس حالت میں موت آ جاتی تو یقیناً جہنم میرا ٹھکانہ ہوتا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کی حقانیت میرے دل میں ڈال دی تو میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: ''آپ ﷺ ہاتھ بڑھائیں تاکہ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کروں۔'' آپ ﷺ نے اپنا دست مبارک پھیلایا تو میں نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

Marfat.com

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''عمرو تمہیں کیا ہوا؟''

میں نے عرض کیا: ''میں ایک شرط لگانا چاہتا ہوں۔''

آپ ﷺ نے پوچھا: ''تم کیا شرط لگانا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا: ''یہ کہ میرے گناہ معاف کر دیئے جائیں۔''

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اسلام، ہجرت اور حج میں سے ہر ایک اپنے سے پہلے دور کے تمام گناہوں کو کالعدم قرار دیتا ہے؟''

اس دور میں رسول اللہ ﷺ سے زیادہ محبوب اور میری نگاہوں میں آپ سے زیادہ قابل احترام اور کوئی نہ تھا۔ آپ ﷺ کی عظمت کے باعث میں آپ کو آنکھ بھر کے نہ دیکھ سکتا تھا۔ اگر مجھے اس حالت میں موت آجاتی تو مجھے امید تھی کہ مجھے جنت نصیب ہو جاتی۔ اس کے بعد ہم ایسے معاملات میں پڑ گئے کہ میں اُن کی نسبت اپنی حالت کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''جب میری روح قبض ہو جائے تو میرے جنازے کے ہمراہ آگ اور نوحہ کرنے والی عورتوں کو نہ آنے دینا۔ نیز مجھے دفن کر کے میری قبر پر مٹی ڈال دینا اور پھر اس کے پاس اتنی دیر تک ٹھہرے رہنا کہ جتنی دیر میں اونٹ کو ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کر دیا جاتا ہے تاکہ میں تم لوگوں سے اُنس حاصل کروں اور دیکھ لوں کہ میں اپنے پروردگار کے فرشتوں کے سوالات کا کیا جواب دیتا ہوں؟''(۱)

ہم نے بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا ہوگا جو کفر کے تاریک دور میں موت کا شکار نہ ہونے پر اللہ تعالیٰ کی حمد و تعریف کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف اپنے ایمان کے ساتھ ایسے ہی متوجہ ہوتے ہیں جیسے حضرت عمرو بن عاصؓ کفر کی حالت میں موت کا شکار نہ ہونے پر اللہ تعالیٰ کے حضور تضرع اور حمد کرتے تھے۔ اگر ہم ایسے لوگوں کی زندگی کے دوسرے اور تیسرے دور میں بھی ایمانی جذبات سے بھرپور زندگی کا سامان مہیا کر دیں تو ان کی زندگی کے آخری لمحات بھی حمد و شکر کی کیفیت میں گزرنے لگیں گے۔

---

(۱) مسلم: کتاب الایمان، ۱۹۲

Marfat.com

دعوت کے کام کی کوئی حد نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اپنی جانیں محبت کی راہ میں قربان کرنے کی نذر مانی ہوئی ہے، ان کے لئے تو خاص طور پر دعوتی کام کی کوئی متعین حد نہیں ہے۔ محبت کے فدائی وہ لوگ ہیں، جنھوں نے اللہ کی محبت سے پوری انسانیت کے دلوں کو منور کرنے کے لئے اپنی جانوں کو وقف کر رکھا ہے۔ لوگوں کے دلوں کو محبت الٰہیہ کے نور سے بھرنے اور حیاتِ جاوداں تک رسائی کے لئے راستوں کی تلاش کے علاوہ انہیں کوئی فکر دامن گیر نہیں ہوتی۔ دورِ حاضر میں ایسے حوصلہ مند لوگوں نے جو ذمہ داری اٹھا رکھی ہے اس کے اور بھی بعض سنجیدہ پہلو ہیں، کیونکہ اگرچہ مختلف مقامات پر از سرِ نو اسلام کی طرف رجوع کے امید افزا حالات دیکھنے میں آ رہے ہیں، لیکن لوگوں کی اکثریت اللہ تعالیٰ سے دوری کی حالت میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ ایسے لوگوں کو اس بھنور سے نکالنا جہاں بہت بلند کام ہے وہیں انتہائی مشکل بھی ہے۔ جنون کی حد تک مرگی کے مریض اور بدبودار اور خطرناک دلدل میں دھنسے ہوئے مغرور شخص سے یہ کہنا بہت مشکل اور تکلیف دہ ہوتا ہے کہ اپنے حال کی اصلاح کرو۔ اس سے بھی زیادہ مشکل کام جوہڑ میں گری ہوئی نسل کو بیدار کرنا اور اس کی توجہ اپنے دل کی پاکیزگی کی حفاظت اور خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط بنانے کی طرف مبذول کرانا ہے، لیکن ہمیں ان مشکلات اور تکلیفوں کو برداشت کرنا ہوگا۔ ان مشکلات سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے لئے محبت اور درگزر کرنے کی عادت بہترین راہنما ہے۔ لوگ حیاتِ جاوداں حاصل کر لیتے ہیں یا انہیں اس بارے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ ہم چاہتے ہیں کہ وہ سب کے سب اپنی ابدی زندگی میں کامیابی سے ہمکنار ہوں، لیکن انہیں اس راستے کی ہلاکت خیزیوں کا علم نہیں، اسی لئے ہم انہیں بچانے کے لئے جو سعی و کوشش کرتے ہیں اس پر انہیں تعجب ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات اُلٹا ہم پر ناراض ہو کر ہمارے راستے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ ان کا یہ طرزِ عمل اُن کی حیاتِ جاوداں سے محرومی کا سبب بن جاتا ہے، اس لئے ہمارا طرزِ عمل اُن کے اِس طرزِ عمل کے برعکس ہونا چاہیے۔ اگر انہیں اپنی حالت کی سنگینی کا احساس ہو جاتا تو انہیں ہماری اِس قدر سعی و کوشش اور فکر مندی کی وجہ معلوم ہو جاتی۔ وہ دوڑ کر ہماری طرف آتے اور ہمارے دلوں کو خوشی و مسرت کے جذبات سے بھر دیتے۔ اس لئے ان کے ہم پر تعجب کا اظہار کرنے اور ہماری راہ میں رکاوٹ بننے کے باوجود ہمیں انہیں مسلسل بیدار اور متنبہ کرتے رہنا چاہیے۔ آسمانِ ہدایت کے

Marfat.com

آفتاب وماہتاب انبیائے کرام، اولیائے عظام اور برگزیدہ بندوں کا یہی اُسوہ رہا ہے۔

مثال کے طور پر حضرت نوح علیہ السلام کو شدید اصرار کے باوجود اپنے بیٹے کے کشتی میں سوار ہونے سے انکار کی وجہ سے کس قدر تکلیف اور ان کے جذبات کو کس قدر ٹھیس پہنچی ہو گی۔ پھر آپ علیہ السلام نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے اُسے غرق ہونے سے بچانے کے لئے کیسے دعا کی، یہاں تک کہ ان دونوں کے درمیان موج حائل ہوگئی؟[1] دورِ حاضر میں اِس قسم کے سینکڑوں واقعات ہمارے لئے اسی طرح کے دکھ اور دردمندی کا باعث بنتے رہتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا بتوں کی پوجا کرنا ان کے لئے انتہائی تکلیف اور پریشانی کا باعث تھا، چنانچہ آپ نے ہر ممکن طریقے سے اسے حق بات سمجھانے کی کوشش کی،[2] لیکن اسے ہدایت نصیب نہ ہوئی۔ انبیائے کرام علیہم السلام کے اسوہ حسنہ میں دورِ حاضر کے فدایانِ محبت کے لئے بہت سی سبق آموز باتیں موجود ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس چچا کو جس نے چالیس برس تک آپ ﷺ کی حفاظت وحمایت کی تھی بسترِ مرگ پر مخاطب کر کے کہا تھا: "اے چچا! ایک بار "لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ" کہہ دیجئے تاکہ میں کل قیامت کے دن اللہ کے حضور آپ کے حق میں دلیل پیش کر سکوں۔"[3]

لوگوں کی ہدایت کی خاطر اپنی جان تک کی پرواہ نہ کرنے والے اس غمگین نبی کا اسوہ حسنہ ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ جس قوم نے آپ کا محاصرہ کیا اور آپ ﷺ کو ہر قسم کی تکلیف پہنچائی، آپ ﷺ نے اسے محبت، درگزر اور رحمت کے سوا کچھ نہ دیا۔[4] آپ ﷺ نے ان کے ساتھ محبت کا معاملہ کیا، جس کے نتیجے میں کامیابی نے آپ ﷺ کے قدم چومے۔

---

(۱) دیکھئے: سورۃ ھود؛ ۴۲-۴۳

(۲) دیکھئے: سورۃ الانعام: ۷۴

(۳) البخاری: مناقب الأنصار، ۴۰؛ الترمذی: تفسیر القرآن، ۲۸/ ۲۹؛ النسائی: الجنائز، ۱۰۲

(۴) الهیثمی: مجمع الزوائد: ۶/ ۳۵؛ علی القاری: شرح الشفاء للقاضی عیاض: ۱/ ۲۷۹

Marfat.com

آپ ﷺ نے اپنے بعد بھی ایک ایسا راستہ چھوڑا کہ جو شخص بھی حسن معاملگی کے ساتھ تکالیف کو برداشت کرتے ہوئے اس پر چلے گا وہ لاکھوں انسانوں کو حیاتِ جاوداں سے ہمکنار کرنے کا باعث بنے گا۔

اس عالی مرتبت فریضے کا قیام مکمل طور پر فدایانِ محبت وشفقت پر منحصر ہے۔ یہ ایسے لوگوں کا فریضہ ہے جو دوسروں کی راحت کی خاطر اپنی راحت قربان کر دیتے ہیں، جو اپنے معاشرے کے لوگوں کو جنت کا راستہ دکھائے بغیر جنت میں بھی سکون سے نہیں بیٹھیں گے۔ ایک محبت وشفقت کے پیکر نے کیا خوب بات کہی ہے:

> ''میں نے معاشرے کے ایمان کی حفاظت کی خاطر اپنی آخرت بھی قربان کردی ہے۔ اب میرے دل میں جنت کا شوق ہے اور نہ جہنم کا خوف۔ وہ شخص کتنا خوش نصیب ہے جو نہ صرف ترکی کے دو کروڑ لوگوں کے ایمان کی حفاظت کی خاطر، بلکہ پورے عالم اسلام کی بیسیوں کروڑ آبادی کے ایمان کی حفاظت کی خاطر قربان ہوگیا۔ اگر کوئی جماعت قرآن کے پرچم کو روئے زمین پر بلند رکھنے والی باقی نہ رہی تو مجھے جنت میں جانے کا شوق بھی نہیں رہے گا، کیونکہ ایسی صورت میں جنت بھی میرے لئے قید خانے سے کم نہ ہوگی اور اگر ہماری امت کا ایمان محفوظ رہے تو مجھے جہنم کے شعلوں میں جلنا بھی گوارا ہے، کیونکہ ایسی صورت میں اگرچہ میرا بدن تو جل رہا ہوگا ،لیکن میرا دل خوشی ومسرت سے شاد ہوگا۔''(۱)

یہ تو فدائیوں کی حالت ہے۔ صدیقین کا مقام اِس سے بھی بلند ہے۔ وہ تو یہ دعا کرتے ہیں کہ ہمارا جسم اِس قدر بڑا ہو جائے کہ جہنم میں اللہ کے کسی اور بندے کے داخل ہونے کی جگہ ہی باقی نہ رہے۔

اِن باتوں کو عملی زندگی میں اپنانا انتہائی مشکل ہے، لیکن یہ روح کی بے قراری کی کیفیت

(۱) آپ بیتی: بدیع الزمان نورسی، ص: ۴۵۷

Marfat.com

(جو اگرچہ ایک لمحے کے لئے ہی کیوں نہ ہو) سمندر جیسی وسیع شفقت کا اندازہ لگانے میں کسی حد تک معاون ثابت ہوسکتی ہیں۔

رسول اکرم ﷺ کو اپنی امت پر کس قدر شفقت تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ حشر کے ہولناک وقت میں بھی اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو کر انتہائی عاجزی و خشوع کے ساتھ ''امتی امتی'' پکاریں گے، حالانکہ آپ ﷺ کو معلوم ہوگا کہ میری امت کے بعض افراد جہنم میں ضرور جائیں گے۔ آپ ﷺ اس وقت تک اپنا سر سجدے سے نہیں اٹھائیں گے جب تک کہ آپ کے کانوں میں یہ آواز نہیں آئے گی: ''اے محمد (ﷺ) اپنا سر اٹھایئے! آپ جو مانگیں گے آپ کو عطا کیا جائے گا اور جس کی شفاعت کریں گے اس کے حق میں آپ (ﷺ) کی شفاعت قبول کی جائے گی۔''(۱) یہ جہاں نبی کریم ﷺ کی اپنی امت پر بے مثال رحمت و شفقت کا نمونہ ہے وہیں محبت کے سب سے بڑے فدائی کی مثال بھی ہے۔ محبت کا ایسا فدائی صرف وہی شخص ہوسکتا ہے، جو لوگوں کے دکھ اور درد کی خاطر اپنی نفسانی لذتوں، خاندانی خوشیوں اور دنیوی مشاغل کو بھلا دے اور اپنے ذاتی مفادات سے بلند ہو کر سوچے، بلکہ جو شخص صحیح طور پر محبت کا فدائی نہ ہو، اس کے لئے پورے طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنا ممکن ہی نہیں۔

۳۔ تبلیغ سب سے قیمتی تحفہ

تبلیغ کے فریضے کو لوگوں کے درمیان تحائف کے تبادلے کے ساتھ تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ آپ لوگ مختلف قسم کی تقریبات اور شادیوں کے مواقع پر ایک دوسرے کو تحفے تحائف دیتے ہوں گے نیز تحفہ دینے سے پہلے آپ یقیناً سوچتے ہوں گے کہ میں کس قسم کا تحفہ خرید سکتا ہوں اور جس شخص کو تحفہ دینا ہے اس کے لئے کس قسم کا تحفہ مناسب ہوگا؟ یہ ایک عام رواج ہے جو مفید بھی ہے۔ اس سے جہاں ایک دوسرے کی ضروریات پوری ہوتی ہیں وہیں محبت بھی بڑھتی ہے۔ بعینہ یہی

(۱) البخاری: کتاب التوحید: ۳۶ تفسیر القرآن: ۵؛ مسلم: الایمان: ۳۲۶۔۳۲۷ الترمذی: القیامة: ۱۰

Marfat.com

صورت اُس وقت بھی پیدا ہوتی ہے جب آپ اپنی معاشرتی زندگی میں شریک لوگوں اور دوستوں سے ملنے جاتے ہیں۔ جس طرح آپ تحائف کے تبادلے کے وقت دقت نظر اور اہتمام کا مظاہرہ کرتے ہیں، اسی طرح کی دقت نظری اور اہتمام کا مظاہرہ اُن کے ساتھ ملاقات کے وقت دیگر تمام امور میں بھی کرنا چاہیے۔

ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ دورِ حاضر میں انسان کی سب سے بڑی ضرورت مختصر سی پاکیزہ گفتگو اور نصیحت کی بات ہے، نیز آج کا سب سے قیمتی تحفہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اس فریضے کو بہترین طریقے سے سرانجام دینے کے لئے ہم پر جو سب سے پہلی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، وہ مخاطب یا مخاطبین کے حالات سے واقفیت حاصل کرنا اور اُن کی ضروریات کی درست تشخیص کرنا ہے، ورنہ یہ ایسے ہی ہوگا جیسے آپ کسی شخص کو ایسا نامناسب لباس پہنانا چاہیں جس سے اسے کوفت ہوتی ہو، باوجود اِس کے کہ کسی کو کپڑے پہنانا نیکی کا کام ہے، لیکن اِس مخصوص صورتِ حال میں یہ برائی ہے، اگرچہ وہ کپڑا انتہائی قیمتی اور عمدہ ہی کیوں نہ ہو۔

جو شخص مختلف قسم کے گمراہ کن نظریات وافکار سے متاثر ہو، اس کے خیالات کو پاکیزہ بنائے بغیر اسے آسمانِ علم کی رفعتوں سے روشناس کرانے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ جس کا دل بے نور اور روح تاریک ہو، اس کے وِجدان کے آئینے میں آسمان کے ستاروں کی چمک منعکس نہیں ہوسکتی۔ کلام کو پُر تاثیر اور گفتگو کو ثمر آور بنانے کے لئے کسی بھی انسان کی ضروریات کا درست اندازہ لگانا انتہائی اہم ہوتا ہے۔ شاید آپ اسے جھنجھوڑنے میں کامیاب ہو جائیں، جو اُس کی ہدایت کا سبب بن جائے۔ شاید درد انگیز آہ وزاری سے معمور آپ کی حسرتیں اس کے روحانی خلا کو پر کرنے اور اس کی روحانی ضروریات کی تکمیل کا باعث بن جائیں۔ کسی انسان کو راہِ راست پر لانے کے لئے غم والم سے بھرپور آہ وزاری اور نرم گفتگو سے بڑھ کر قیمتی کوئی تحفہ نہیں ہوسکتا۔ بعض اوقات یہ آہ وزاری اور شیریں گفتگو کسی انسان کے آئندہ کے تمام غلط کاموں سے رُکنے اور دوبارہ استقامت کے ساتھ اچھائی کا راستہ اختیار کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ وہ تحفہ جو کسی انسان کو برائی سے بچا کر

Marfat.com

نہیں کی تھی، لیکن اُس دن میں بھی جھنڈے کے حصول کی امید سے سر اٹھا اٹھا کر نمایاں ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔''(۱) اِس کی وجہ یہی تھی کہ اِس میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت کی ضمانت تھی۔ صحابہ کرامؓ نے اس عظیم بشارت کے انتظار میں رات آنکھوں میں کاٹی۔ ہر ایک اسی خیال میں گم تھا کہ دیکھو جھنڈا کس خوش نصیب کو ملتا ہے؟ صبح سویرے ہر ایک بشارت کا شدت سے انتظار کرنے لگا، چونکہ فجر کی نماز کے بعد جھنڈا حوالے کیا جاتا تھا، اس لئے ہر ایک نے پہلی صف میں جگہ پانے کی کوشش کی۔ جوں ہی نبی کریم ﷺ نے نماز ختم کی، نگاہیں اس انتظار میں آپ ﷺ پر مرکوز ہو گئیں کہ دیکھو آپ ﷺ کے مبارک ہونٹوں پر کس کا نام آتا ہے۔ اب اس عظیم خوشخبری کے سنانے کا وقت آ پہنچا تھا۔ دوسری طرف صحابہ کرام کی بے چینی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ جنت کی خوشبو کی طرح مہکتے اُس دہن مبارک سے دنیا کے سب سے زیادہ خوش بخت و خوش نصیب شخص کا نام نکلا، آپ ﷺ نے نرمی اور شفقت سے بھرپور لہجے میں فرمایا: ''علی کہاں ہے؟'' اس وقت سب کو پتہ چل گیا کہ وہ خوش قسمت انسان حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ لیکن ابھی بھی صحابہ کرام کے دل میں اس وجہ سے امید کی کرن باقی تھی کہ آشوبِ چشم کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ موقع پر موجود نہ تھے۔ صحابہ کرام نے اس امید کو دل میں لئے جواب دیا کہ وہ بیمار ہیں اور آرام کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو بلایا اور اپنی انگشت مبارک سے اپنے دہن مبارک سے لعاب لے کر حضرت علی کی آنکھ پر انگشت مبارک پھیری۔ آپ رضی اللہ عنہ کی آنکھ فوراً صحت یاب ہو گئی، بلکہ اس کے بعد عمر بھر آپ کی اس آنکھ میں کبھی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔

اس طرح جھنڈا اپنے خوش قسمت مالک کے ہاتھ میں آ گیا۔ حضرت علیؓ اسے لے کر خیبر کی طرف روانہ ہوئے، لیکن پھر اچانک ٹھہر کر رسول اللہ ﷺ سے استفسار کیا کہ ہم اُن سے کس بنیاد پر جنگ کریں؟ اور انہیں کس بات کی دعوت دیں؟ تو سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اُنْفُذْ عَلَىٰ رِسْلِكَ حَتّٰى تَنْزِلَ بِسَاحَتِهِمْ ثُمَّ ادْعُهُمْ اِلَى الْاِسْلَامِ

---

(۱) المسند: أحمد بن حنبل، ۲/۳۸۴؛ ابن سعد، الطبقات: ۲/۱۱۰

Marfat.com

نہیں کی تھی، لیکن اُس دن میں بھی جھنڈے کے حصول کی امید سے سر اٹھا اٹھا کر نمایاں ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔"(۱) اِس کی وجہ یہی تھی کہ اِس میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت کی ضمانت تھی۔ صحابہ کرامؓ نے اس عظیم بشارت کے انتظار میں رات آنکھوں میں کاٹی۔ ہر ایک اسی خیال میں گم تھا کہ دیکھو جھنڈا کس خوش نصیب کو ملتا ہے؟ صبح سویرے ہر ایک بشارت کا شدت سے انتظار کرنے لگا، چونکہ فجر کی نماز کے بعد جھنڈا حوالے کیا جانا تھا، اس لئے ہر ایک نے پہلی صف میں جگہ پانے کی کوشش کی۔ جوں ہی نبی کریم ﷺ نے نماز ختم کی، نگاہیں اس انتظار میں آپ ﷺ پر مرکوز ہوگئیں کہ دیکھو آپ ﷺ کے مبارک ہونٹوں پر کس کا نام آتا ہے۔ اب اس عظیم خوشخبری کے سنانے کا وقت آ پہنچا تھا۔ دوسری طرف صحابہ کرام کی بے چینی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ جنت کی خوشبو کی طرح مہکتے اُس دہن مبارک سے دنیا کے سب سے زیادہ خوش بخت و خوش نصیب شخص کا نام نکلا، آپ ﷺ نے نرمی اور شفقت سے بھر پور لہجے میں فرمایا: "علی کہاں ہے؟" اس وقت سب کو پتہ چل گیا کہ وہ خوش قسمت انسان حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ لیکن ابھی بھی صحابہ کرام کے دل میں اس وجہ سے امید کی کرن باقی تھی کہ آشوبِ چشم کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ موقع پر موجود نہ تھے۔ صحابہ کرام نے اس امید کو دل میں لئے جواب دیا کہ وہ بیمار ہیں اور آرام کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو بلایا اور اپنی انگشت مبارک سے اپنے دہن مبارک سے لعاب لے کر حضرت علی کی آنکھ پر انگشت مبارک پھیری۔ آپ رضی اللہ عنہ کی آنکھ فوراً صحت یاب ہوگئی، بلکہ اس کے بعد عمر بھر آپ کی اس آنکھ میں کبھی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔

اس طرح جھنڈا اپنے خوش قسمت مالک کے ہاتھ میں آ گیا۔ حضرت علیؓ اسے لے کر خیبر کی طرف روانہ ہوئے، لیکن پھر اچانک ٹھہر کر رسول اللہ ﷺ سے استفسار کیا کہ ہم اُن سے کس بنیاد پر جنگ کریں؟ اور انہیں کس بات کی دعوت دیں؟ تو سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اُنْفُذْ عَلٰی رِسْلِكَ حَتّٰی تَنْزِلَ بِسَاحَتِهِمْ ثُمَّ ادْعُهُمْ اِلَی الاِسْلَامِ

(۱) المسند: أحمد بن حنبل، ۲/۳۸۴؛ ابن سعد، الطبقات: ۲/۱۱۰

Marfat.com

وَاَخْبِرْهُمْ يَجِبُ عَلَيْهِمْ مِنْ حَقِّ اللّٰهِ فِيهِ فَوَاللّٰهِ لَأَنْ يَهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلاً وَاحِدًا خَيْرٌ لَكَ مِنْ اَنْ يَكُونَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ۔"

میں جنگ تک اپنی رفتار سے چلتے جاؤ۔ وہاں پہنچ کر انہیں اسلام کی دعوت دینا اور اسلام کی وجہ سے اُن پر اللہ تعالیٰ کے جو حقوق عائد ہوں گے ان سے انہیں آگاہ کرنا۔ خدا کی قسم! تمہاری وجہ سے ایک انسان کا ہدایت پا جانا تمہارے لئے سرخ اونٹنیوں سے بہتر ہے۔"(1)

اس کے بعد جب بھی کوئی اسلامی لشکر کہیں جاتا تو اُس کے ہر سپاہی کو اپنے کانوں میں نبی کریم ﷺ کے اِس واجب التعمیل حکم کی بازگشت سنائی دیتی رہتی۔

ماضی میں مذکورہ بالا حدیث جیسی احادیث اور نبی کریم ﷺ کی زندگی کے اُسوہ حسنہ کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام نافذ العمل رہا۔

اسلامی لشکر سے پہلے دعوتی جماعتیں مختلف علاقوں میں جا کر حق بات کی دعوت دیتیں اور مسلمانوں کے لئے فضا سازگار بناتیں۔ اگر ان علاقوں کے لوگ ان کی دعوت قبول کر کے اسلام لے آتے تو اُن کا علاقہ دارالاسلام قرار دے دیا جاتا، لیکن اگر وہ مقابلہ اور مزاحمت کرتے اور اسلام کی اشاعت کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے تو گزشتہ سطور میں ذکر کردہ قواعد کی روشنی میں فتح ناگزیر ہو جاتی یعنی مسلمان پہلے کفار کو اسلام کی دعوت دیتے تھے، کیونکہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ ایک انسان کی ہدایت پوری دنیا کے سرخ اونٹوں کو راہِ خدا میں خرچ کرنے سے بہتر ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ انسانیت کے نام پر جو سب سے خوبصورت تحفہ ایک مسلمان کسی کو پیش کر سکتا ہے، وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی ہے۔ اس فریضے کو احسان اور نرمی سے ادا کرنا ہی سب سے بڑا اور قیمتی تحفہ ہے۔

---

(1) البخاری: فضائل أصحاب النبی، ۹؛ مسلم: فضائل الصحابة، ۳۴

Marfat.com

۴۔ تبلیغ اور مستقل مزاجی

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ دوام اور ثابت قدمی کا متقاضی ہے۔اس بات کی وضاحت درج ذیل آیت سے ہوتی ہے:

"کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ اُخرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأمُرُونَ بِالمَعرُوفِ وَتَنھَوْنَ عَنِ المُنکَرِ وَتُؤمِنُونَ بِاللّٰہِ"

"(مومنو) جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئی ہیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔" [آل عمران: ۱۱۰]

اگر ہم اس آیت مبارکہ کے الفاظ پر ذرا گہرائی سے غور کریں تو اس کے قرآنی مطالب ہمارے سامنے واضح ہو جائیں گے۔

یہاں 'کُنتُم' کا لفظ 'أصبحتم' (تم ہو گئے ہو) کے معنی میں ہے۔اس سے یہ مراد نہیں کہ تم پہلے سے ہی ایسے تھے، لہٰذا 'کُنتُم' کی تعبیر اختیار کرنے میں بڑی لطافت موجود ہے 'کینونة' کا مطلب ہوتا ہے عدم سے وجود میں آنا۔حاصل یہ کہ تمہیں یہ خصوصیت بعد میں حاصل ہوئی ازل سے تم میں موجود نہ تھی، جو کیفیت ازل سے حاصل ہو وہ کبھی زائل نہیں ہوتی اور جو چیز زائل ہو جاتی ہے وہ حادث اور حالات کا نتیجہ ہوتی ہے، یعنی ایسی حالت کا دوام اور ثبات اُن حالات کی موجودگی کے ساتھ مشروط ہوتا ہے، جن کی وجہ سے وہ حالت وجود میں آتی ہے۔

'کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ' کا معنی ہے تم بہترین امت ہو گئے، یعنی یہ ایک حادث، اکتسابی اور طاری ہونے والی حالت ہے، جس کا زوال بھی ممکن ہے۔بہترین ہونے کا وصف ہمارا ذاتی وصف نہیں، کیونکہ بنیادی طور پر ہمارے اور ماسکو یا کسی اور جگہ پیدا ہونے والے کسی شخص کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ہم سب پانی کے ایک قطرے سے پیدا کیے گئے ہیں۔صرف ایک معنوی محرک اور کسی خاص سبب سے پیدا ہونے والی تاثیر ہی ہے، جو ہمارے روحانی وجود اور حقیقت کو 'خیر' کی طرف متوجہ کرتی ہے۔یہاں ہم سے میری مراد پوری امت ہے۔یہ امت ازل سے بہترین امت نہیں تھی، بلکہ اسے خیریت کی یہ صفت بعد میں عطا کی گئی ہے، جو اس سے الگ اور جدا بھی ہو سکتی ہے۔خاص اسباب کی بنا پر یہ امت بہترین امت کہلائی ہے۔اگر وہ اسباب باقی نہ رہے تو یہ امت بہترین امت

Marfat.com

ہونے کے مقام سے بھی محروم ہو جائے گی۔

چنانچہ اس امت کے بہترین ہونے کے لئے پہلی شرط درج ذیل ہے:

﴿تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ "نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو۔" یعنی اگر تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہے تو تم بہترین امت قرار پاؤ گے۔ اس آیت مبارکہ کے مفہومِ مخالف سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر تم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیا تو تم بدترین امت ٹھہرو گے۔ بہت سی احادیث نبویہ اور آثارِ صحابہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

جب تک یہ امت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو ادا کرتی رہی دنیا میں معزز اور دوسری قوموں پر فائق رہی، لیکن جوں ہی اِس نے اِس مقدس فریضے کو پس پشت ڈالا ذلت اور رسوائی اس کا مقدر بن گئی۔ آج عالم اسلام جس ذلت اور رسوائی سے دوچار ہے، جس کی وجہ سے معاشرتی زندگی کی ہر سطح پر مسلمان اپنی اہمیت کھو چکے ہیں اس کا بنیادی سبب اس حیات بخش فریضے سے لاپرواہی برتنا ہے۔

اس جلیل القدر فریضے کی عدم ادائیگی کی وجہ سے وحی کی برکات کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔ افکار میں بانجھ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ عقلی دلائل کمزور اور بے اثر ہو جاتے ہیں۔ گفتگو خشک اور بے ثمر ہو جاتی ہے، جس کے نتیجے میں گفتگو میں مزید ابہام پیدا ہو جاتا ہے اور اس میں سے حقیقت مکمل طور پر مفقود ہو جاتی ہے۔ یہ سب وحی کی برکات سے محرومی کی علامات ہیں۔ جب غور و فکر اور تفکیر کا الہام سے رابطہ منقطع ہو جاتا ہے تو ہر چیز میں یہاں تک مادی اور ٹیکنیکل علوم میں بھی انحطاط اور زوال شروع ہو جاتا ہے۔

یہ تقدیر کا اٹل فیصلہ ہے کہ جب تک مسلمان وحی کی برکات سے محروم رہیں گے اُس وقت تک وہ ہر میدان اور شعبے میں دوسری قوموں کے محتاج اور ان کے در کے سوالی بنے رہیں گے۔ وہ دوسروں کے دست نگر بن جائیں گے۔ ہمارے زوال اور انحطاط کا آغاز ہمارے روحانی نظام کی کمزوری کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔

اس مسئلے کی مزید وضاحت ہم مختلف مثالوں کے ذریعے آئندہ فصول میں کریں گے، اب

Marfat.com

ہم اپنے سابقہ موضوع کی طرف دوبارہ آ کر آیت مبارکہ میں مذکور دیگر امور پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ہم نے گزشتہ سطور میں یہ بات واضح کی تھی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ دوام اور ثابت قدمی کا متقاضی ہے، جیسا کہ اس کی طرف درج ذیل آیت مبارکہ میں بھی اشارہ ملتا ہے: ﴿كُنتُم خَيرَ أُمَّةٍ أُخرِجَت لِلنَّاسِ...﴾

درج ذیل حدیث شریف سے اِس بات کی مزید تائید ہوتی ہے:

"مَنْ رَأَى مِنكُمْ مُنكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ"

"تم میں سے جو بھی کسی برائی کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے روکے، اگر وہ اس کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے اور اگر اسے اتنی بھی قدرت نہ ہو تو کم از کم اُسے دل سے برا جانے۔ یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔"(1)

منکر ہر اس کام کو کہتے ہیں جسے اسلام برا قرار دے، لہٰذا اگر کوئی مسلمان کوئی ایسا کام ہوتے ہوئے دیکھے جسے اسلام برا سمجھتا ہے تو اس کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ اسے روک دے، روکنے کی کیفیت منکر کی صورتِ حال کے پیش نظر مختلف ہو سکتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ منکر کی روک تھام کے لئے جدو جہد کی جائے جو کہ دوام اور ثابت قدمی کی متقاضی ہے۔

منکر کی روک تھام کے سلسلے میں پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اسے طاقت سے روک دیا جائے، اگر طاقت سے روکنے کی قدرت نہ ہو تو زبان سے روکا جائے، جس میں تقریر اور تحریر دونوں داخل ہیں۔ اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو کم از کم اس منکر کو دل سے برا سمجھا جائے۔ یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ اس کے بعد ایمان کا کوئی درجہ نہیں کیونکہ یہ منکر پر رضامندی کے مترادف ہے۔

درج ذیل سطور میں منکر پر دل سے انکار کرنے اور اسے دل سے برا سمجھنے پر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

جب انسان کسی شخص سے ناراض ہوتا ہے تو وہ اس کی ہم نشینی اختیار کرنے یا اس کے ساتھ

(1) مسلم: کتاب الایمان، ۷۸؛ الترمذی: الفتن، ۱۱

Marfat.com

تبادلہ آراء وافکار کرنے سے احتراز کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے، کیونکہ ایک ہی وقت میں ایک ہی دل میں محبت اور دشمنی جمع نہیں ہوسکتی اور نہ ہی انسان جس شخص کو ناپسند کرتا ہو اس کے ساتھ قلبی لگاؤ رکھ سکتا ہے، لہٰذا جو مسلمان بھی کسی برائی پر غصے اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے، وہ اپنی روحانی اور معنوی قوت کو محفوظ کرلیتا ہے، لیکن صرف اس قدر ردِعمل کافی نہیں۔ مسلمان سے صرف یہی مطلوب نہیں، بلکہ اس قلبی ناپسندیدگی کے بعد زبان اور ہاتھ کے ذریعے منکر کی روک تھام کا مرحلہ بھی آنا چاہیے، لیکن اس کے باوجود برائی سے دل کا جزوی طور پر متنفر ہونا بھی ایمان کی موجودگی کی علامت ہے، کیونکہ کوئی مسلمان کسی ایسی چیز کو درست نہیں سمجھ سکتا، جسے اسلام درست نہ سمجھتا ہو، حتیٰ کہ اگر کوئی مسلمان اس منکر کا ارتکاب کرنے والوں کے ساتھ بھی رہتا ہو، تب بھی وہ ان کے اس کام کو برا سمجھے گا، ورنہ تو وہ خود انہیں میں شمار ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مسلمان روحانی اور معنوی قوت کے اعتبار سے ہمیشہ بلند مقام پر فائز رہتا ہے۔ مذکورہ بالا آیت مبارکہ اور حدیث نبوی سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔

بعض اوقات انسان اپنے اہل وعیال کے حق میں اس فریضے کو ہاتھ اور زبان کے ذریعے ادا کرتا ہے۔ ایسی صورت حال میں گویا زبان اور ہاتھ دونوں بولتے ہیں، لیکن جہاں ہاتھ کے ذریعے اس فریضے کی ادائیگی ممکن نہ ہو وہاں زبان کا استعمال ضروری ہوجاتا ہے۔ عام طور پر یہ طریقہ دیگر عزیز واقارب کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے۔ اگر انسان کو اس پر بھی قدرت نہ ہو تو پھر اسے ایسے لوگوں کے ساتھ اپنے قلبی تعلقات پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ اسے قطع تعلقی کی ایک صورت بھی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ جو شخص برائی کا ارتکاب کرتا ہے درحقیقت وہ اپنے رب سے قطع تعلقی کرلیتا ہے اور جو شخص اپنے رب سے قطع تعلقی کرے ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ اس سے قطع تعلقی کرلے اور اس کی عزت واحترام کرنے سے مکمل طور پر احتراز کرے۔ ایک مسلمان کو دوسرے لوگوں کے ساتھ ایسے ہی تعلقات رکھنے چاہئیں جیسا کہ وہ اپنے رب کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ اپنا ناطہ توڑ لے اس کے ساتھ تعلقات اور راہ ورسم رکھنے پر نظر ثانی کرنی کی ضرورت ہوتی ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہی طرزِ زندگی تھا۔ اس سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وہ گفتگو ہمارے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے، جو آپ ؓ نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں مشورہ کے وقت ارشاد فرمائی تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا: ''اے ابن خطاب!

Marfat.com

تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟'' تو انہوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! خدا کی قسم اس بارے میں مجھے ابوبکرؓ کی رائے سے اتفاق نہیں، بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ آپ ہمیں ان کی گردن زنی کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ آپ علی کو اجازت دیں کہ وہ عقیل کی گردن اُڑائے اور مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے فلاں رشتہ دار کو قتل کروں۔ کیونکہ یہ لوگ کافروں کے سرخیل و پیشوا ہیں۔''(۱)

اگرچہ اس مشورے میں آپؓ کی رائے کو قبول نہیں کیا گیا، لیکن اس سے اس سلسلے میں رہنمائی ضرور ملتی ہے کہ ایک مسلمان کو برائی کے بارے میں کیا موقف اختیار کرنا چاہیے۔

ایک مسلمان کے نزدیک دیگر لوگوں کے ساتھ تعلقات اور راہ و رسم کا معیار ان کا خدا کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ وہ خدا سے غافل شخص کا گہرا دوست ہوسکتا ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ مضبوط تعلقات استوار کرسکتا ہے۔ اس کی کم از کم علامت مستقل طور پر دل سے برائی کو برا سمجھنا ہے۔ ہمیں صحابہ کرام کا طرزِ عمل اختیار کرنا ہوگا، لہٰذا اگر اللہ اور اس کے رسول کی محبت ایک پلڑے میں اور خدا سے غافل اعزہ و اقارب کی محبت دوسرے پلڑے میں ہو، تو ہمارے دلوں میں خدا اور اس کے رسول کی محبت کا پلڑا لازماً بھاری ہونا چاہیے۔

بات صرف محبت کی نہیں، بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خاطر حق بات کو ہر چیز سے بالاتر ہونا چاہیے، نیز حسب استطاعت ہاتھ اور زبان کو بھی استعمال کرنا چاہیے اور اگر اس کی قدرت نہ ہو تو فریقِ ثانی سے قلبی لگاؤ ختم کر کے اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ یہ بات یاد رہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کی مخالفت کرتے ہوئے کسی بھی شخص کے ساتھ تعلقات رکھنے کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ ایسے تعلقات بالآخر انسان کی تباہی و بربادی پر منتج ہوتے ہیں۔

اس معاملے کا ایک پہلو اس کا عموم بھی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ریاست کے بھی اولین فرائض میں شامل ہے۔ کیونکہ وہ فحاشی، شراب نوشی، جوابازی اور ذخیرہ اندوزی جیسی

(۱) مسلم: الجہاد ۵۸، المسند: ۱/ ۳۰-۳۲

Marfat.com

برائیوں کو طاقت کے ذریعے روک سکتی ہے۔ بہت سی برائیوں کی روک تھام ایک فرد کے بس میں نہیں ہوتی، لیکن ریاست طاقت کے ذریعے ان کی روک تھام کر سکتی ہے۔ مثلاً زناکار، شرابی اور جوئے باز کو سزا دینا یا طاقت کے ذریعے انہیں ان برائیوں سے روکنا انفرادی طور پر ممکن نہیں۔

ابھی تک تو ہم انفرادی سطح پر اس فریضے کا ذکر کر رہے تھے، اب ہم خارجی دنیا میں انسان کے کردار پر گفتگو کریں گے۔ چونکہ اس سطح پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ادائیگی فرد کے بس میں نہیں ہوتی، اس لئے اس سطح پر اس فریضے کی ادائیگی ریاست کی ذمہ داری ہے، جس سے اسے ہر صورت میں عہدہ برآ ہونا ہے۔ اگر ریاست اس سلسلے میں کوتاہی کرے تو عوام کو چاہیے کہ وہ مختلف پلیٹ فارموں سے مثلاً انتخابات کے ذریعے حکومت کو اس فریضے کی یاددہانی کراتی رہے۔ یہ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک صورت ہے۔ درج ذیل سطور میں ہم خیر القرون سے اس کی ایک مثال قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اُن دس صحابہ میں سے تھے، جنہیں حضور ﷺ نے دنیا میں ہی جنت کی خوشخبری سنائی تھی۔ (۱) آپ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں ایران کو فتح کرنے والے اسلامی لشکر کے سپہ سالار تھے اور فتحِ ایران کے بعد وہاں کے گورنر مقرر ہوئے۔ لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی شکایت کی کہ انہوں نے اپنے دروازے پر دربان مقرر کر رکھے ہیں، حالانکہ گورنر اور رعایا کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہونی چاہیے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے دریافت کیا کہ کیا ان کے بارے میں تمہیں کوئی اور بھی شکایت ہے تو انہوں نے کہا کہ وہ نماز بھی اچھی طرح نہیں پڑھتے۔ (۲) یہ ان لوگوں کا اپنا خیال تھا۔ ورنہ ہم تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ جیسا جلیل القدر صحابی نماز کے ارکان کو اچھی طرح ادا نہ کرتا ہوگا، لیکن جس بات کی طرف ہم یہاں قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے

---

(۱) ابن الأثیر:أسد الغابة،۲/۳۶۶؛ابن عبدالبر:الاستعاب،۲/۵۱۳؛ابن حجر:الاصابة،۳/۷۳

(۲) البخاری:الأذان،۹۵؛مسلم:الصلاة،۱۵۸؛المسند،۱/۱۸۰،۱۷۹،۱۷۶

Marfat.com

کہ کس طرح لوگ ریاست کی اصلاح اور نگرانی کرتے تھے۔عوام ہمیشہ ریاست کے کاموں پر نظر رکھتی ہے اور ریاست عوام کی نگرانی اور اس میں نظم وضبط پیدا کرتی ہے۔اس طرح جہاں توازن پیدا ہوتا ہے وہیں انصاف کی فراہمی بھی یقینی ہوجاتی ہے اور ریاست وعوام دونوں برائیوں کے ارتکاب سے محفوظ رہتے ہیں۔

اگر اس تناظر میں دورِ حاضر میں عالمِ اسلام کا جائزہ لیا جائے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ریاست اور عوام اپنے اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔دورِ حاضر میں عوام ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کرتی ہے،لیکن ریاست لاپرواہی برتتے ہوئے انہیں کھلی چھوٹ دیئے رکھتی ہے، بلکہ بعض اوقات مختلف قسم کے قوانین کے ذریعے انہیں تحفظ فراہم کرتی ہے، حالانکہ برائیوں اور اخلاقی بے راہ روی کی روک تھام ریاست کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔دورِ حاضر میں مختلف ممالک میں جن طرح طرح کے جرائم کا ارتکاب کیا جارہا ہے وہ اس کی واضح مثال ہے۔جرائم کی روک تھام کے لئے تعزیراتی قوانین ہونے چاہئیں۔ریاست کا کوئی فرد از خود چور کو سزا نہیں دے سکتا اور نہ ہی زناکار پر حد جاری کرسکتا ہے، بلکہ کسی بھی قسم کی کوئی تعزیراتی سزا از خود نافذ نہیں کرسکتا۔اگر ہر شخص اپنے فریقِ مخالف پر از خود سزائیں نافذ کرنے لگ جائے تو اس سے ریاست میں انتشار اور بدامنی پھیلے گی۔اس ساری بحث سے ہم درج ذیل نتیجے تک پہنچے ہیں:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بعض صورتیں ریاست کے ساتھ مختص ہیں۔فرد کے لئے انہیں اختیار کرنا ممکن نہیں اور بعض صورتیں افراد کے ساتھ خاص ہیں، جنہیں وہ زبان اور ہاتھ سے ادا کرسکتے ہیں۔مثلاً لوگوں کو زنا، جوئے ، چوری، سود اور ذخیرہ اندوزی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرنا اور معاشرے میں برائیوں کی روک تھام کے لیے جدوجہد کرنا معاشرے کے ہر ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔حاصل یہ کہ طاقت کے ذریعے برائیوں کی روک تھام ریاست کی ذمہ داری ہے، جبکہ زبان سے ان کی روک تھام ہر مسلمان خاص طور پر علماء کا فریضہ ہے۔

جو لوگ تیسری صورت یعنی برائی کو دل سے برا جاننے پر اکتفا کرتے ہیں وہ اس فریضے

Marfat.com

کو پوری طرح ادا کرنے سے قاصر ہیں، لیکن اگر پوری امت دلی طور پر صرف برائیوں سے نفرت ہی کرنے لگتی تب بھی برائیوں کی روک تھام ہو جاتی، مگر بیچارے مسلمانوں سے یہ بھی نہ ہو سکا۔

جس طرح ہم نے گزشتہ سطور میں اس فریضے کی تقسیم امت کے حوالے سے کی ہے اسی طرح افراد کے حوالے سے بھی اس کی تقسیم ممکن ہے۔

بعض مواقع پر فرد بھی ہاتھ کے ذریعے برائیوں کی روک تھام کر سکتا ہے۔ مثلاً اگر جوئے کا کوئی غیر قانونی اڈا چل رہا ہو تو اس اڈے کے مالک کے پاس جا کر اسے بتانا کہ اِس اڈے کو بند کرو ورنہ میں ریاست کو اس بارے میں بتا دوں گا، بھی ہاتھ کے ذریعے نہی عن المنکر کی ایک صورت ہے۔

اگر اڈے کا مالک حکومت کی طرف سے اجازت یافتہ ہے اور تنہا فرد اس برائی کی مذمت نہیں کر سکتا تو اسے چاہیے کہ اڈے کے مالک کو نرم گفتگو سے اس کام کی برائی سے آگاہ کرے اور اگر اُس سے یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم اُس شخص کے ساتھ اپنے تعلقات کی نوعیت کا از سرِ نو جائزہ لے اور اس کے ساتھ قلبی لگاؤ نہ رکھے، نیز دوسرے لوگوں کو بھی اس قسم کا رویہ اختیار کرنے کی ترغیب دے۔ اِس کے بعد کسی اور بات کی ضرورت نہیں رہتی۔

گزشتہ بحث سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آیت مبارکہ میں "کنتم" کا لفظ "أصبحتم" (تم ہو گئے) کے مفہوم میں ہے، جو ہر قسم کے حالات میں دوام اور ثابت قدمی کا متقاضی ہے۔

اگر ریاست بلکہ پوری امت نہی عن المنکر جیسے اہم فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی برتنے لگے تو برائی سے زبان کے ذریعے روکنے کی ذمہ داری افراد پر عائد ہو جاتی ہے، لیکن یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ متمدن انسانوں کو زبردستی کی بجائے صرف دلائل کے ذریعے قائل کیا جا سکتا ہے۔(۱)

(۱) سعید النورسی: صیقل الاسلام، ص: ۵۲۷

Marfat.com

۵- خالق اور مخلوق کے اعتبار سے دعوت و تبلیغ کے مختلف پہلو

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ دو وجہ سے ادا کیا جاتا ہے:

ا: خدا کی رضا کی خاطر

۲: اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ انسانی حقوق کی ادائیگی کی خاطر

دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے، ہر انسان کو اپنے آپ کو اس فریضے کا ذمہ دار سمجھنا چاہیئے اور اس کی ادائیگی کا نماز کی طرح اہتمام کرنا چاہیئے۔ خاص طور پر جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اس فریضے سے غفلت برتی جانے لگے اور معاشرے میں برائیوں کا غلبہ ہونے لگے تو اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس جلیل القدر فریضے کی اہمیت بعض اعتبار سے انفرادی فرائض سے بڑھ کر ہے، کیونکہ جس معاشرے میں برائیوں کا رواج ہو اور نیکی سے روکا جاتا ہو وہاں اس فریضے کی ادائیگی کے بغیر نماز، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کی ادائیگی بھی ممکن نہیں رہتی۔ ایسی صورت میں پوری امت پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

آج کے دور میں میرے نزدیک اس سے زیادہ جلیل القدر کوئی فریضہ نہیں۔ اس لئے میرا تو ایمان ہے کہ جس نے بھی اپنی زندگی اس مقصد کے لئے وقف کر دی ان شاء اللہ وہ دنیوی اور اخروی دونوں زندگیوں میں کامیاب ہوگا۔ ہر انسان کو افہام و تفہیم یا تحریر و تالیف کے ذریعے اس فریضے کی ادائیگی کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ وہ اس کے لئے چاہے جو ذریعہ بھی اختیار کرے، لیکن مقصد خدا کی رضا ہو۔ کوئی سیاسی غرض پیش نظر نہ ہو۔ جس قدر اس میں اخلاص اور سیاسی اغراض سے دوری ہوگی اسی قدر اس میں تاثیر اور دوام ہوگا۔ اخلاص کے بغیر دعوت و تبلیغ کا درخت پوری طرح بار آور نہیں ہوسکتا، بلکہ اخلاص سے خالی ہونے کی وجہ سے آخرت میں وہ وبالِ جان بھی بن سکتا ہے۔ اس لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو سرانجام دینے والے حضرات کو درج ذیل حدیث کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے:

"مَن قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ العُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ"

Marfat.com

''جو شخص اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے لڑتا ہے وہ اللہ کے راستہ میں ہے''(۱)

یعنی اللہ کی رضا کی خاطر کی جانے والی ہر کوشش (مثلاً طلباء کے لئے کوئی عمارت، سکول یا ہاسٹل تعمیر کرنا یا معاشرے کی ضروریات کے لئے کوئی اور ادارہ قائم کرنا) اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر ہونی چاہئے، اس میں کسی اور غرض کی آمیزش نہیں ہونی چاہئے۔ خلاصہ یہ کہ اس فریضے کے اغراض و مقاصد بھی اس کے شایانِ شان ہونے چاہئیں۔

کسی بھی ادارے یا دعوتی یونٹ کے قیام کا مقصد نوجوانوں کی تربیت میں موجود روحانی خلا کو پر کرنا اور ان کے باطن کی اصل فطرت اور پاکیزگی کے مطابق از سرِ نو تعمیر کرنا ہونا چاہئے تاکہ الحاد، بدامنی اور دہشت گردی ہمارے معاشرے میں راہ نہ پا سکے۔ امت مسلمہ کا اللہ تعالیٰ کے راستے میں کیا جانے والا ہر اقدام بے دینوں اور بدامنی پھیلانے والوں کی طاقت کو توڑنے اور ان کے عزائم کو خاک میں ملانے کے لئے ہونا چاہئے۔ نہ صرف فکری، علمی اور عملی میدانوں میں ان کا مقابلہ کرنے کا بلکہ اللہ کی مدد سے مکمل طور پر ان کے خاتمے کا یہی واحد حل ہے۔

یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ اگر ہم نے اس خلا کو پر نہ کیا اور الحاد، دہشت گردی اور بدامنی کے سامنے سدِ سکندری بن کر جرأت کے ساتھ یہ اعلان نہ کیا کہ ''یہ راستہ تمہارے لئے بند ہے جسے عبور کرنا تمہارے لئے ممکن نہیں'' تو اپنے وطن کی سرحدوں کی حفاظت کی خاطر روسیوں، یونانیوں، فرانسیسیوں، انگریزوں اور دوسرے عیسائی گروہوں کے خلاف ہمارے آباء و اجداد کے اس جہاد کی کوئی روحانی باقی اہمیت نہ رہے گی، جس میں انہوں نے اپنے سینوں پر دشمنوں کی گولیاں، گولے اور نیزے کھائے اور ہزاروں کی تعداد میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے۔ میں یہ بات اپنے انجام کے حوالے سے کہہ رہا ہوں ورنہ اللہ تعالیٰ تو ان کی نیکیوں کا انہیں پورا پورا اجر دیں گے اور ان کے اعمال میں سے ایک ذرے کو بھی ضائع نہیں فرمائیں گے۔

---

(۱) البخاری: کتاب العلم، ۴۵؛ الجهاد والسير، ۱۵؛ مسلم: الأمارة، ۱۴۹-۱۵۱؛ الترمذی، فضائل الجهاد: ۱۶

Marfat.com

اگر ہم اخلاقی بے راہ روی اور تخریبی فکر کے سامنے اپنے دروازے چوپٹ کھول دیں تو ہمارے آباء واجداد کے جہاد اور قربانیوں کا کیا مقصد باقی رہ جاتا ہے؟ کیا اپنے کردار کے ذریعے یہ ان شہداء کے خون کے ساتھ مذاق نہیں؟

اُن تین لاکھ شہیدوں کا خون ہرگز رائیگاں نہیں جا سکتا، جنہوں نے ''جنق قلعہ'' نامی جگہ پر اپنی جان و مال کو قربان کر دیا، روسیوں نے ''پالان دوکن''[1] کے شہروں کو تباہ و برباد اور باشندوں کو قتل کر دیا، آرمینیوں نے عہد شکنی کر کے مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپا، جس کے نتیجے میں دو لاکھ مسلمان شہید ہوئے۔ ان مسلمانوں نے برف سے ڈھکی ہوئی فلک بوس چوٹیوں پر اپنے خون سے توحید کی تاریخ رقم کی۔ ہم ان شہداء کے خون کو ہرگز رائیگاں نہیں جانے دیں گے۔ ورنہ ہمیں ''نہ نہ خاتون''[2] اور ''صوتجو امام''[3] جیسے ہزاروں شہداء کی شدید ناراضگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہم اس عظیم ذمہ داری سے کیسے عہدہ برآ ہوسکیں گے؟ لہٰذا ہمیں بھی دعوت کے میدان میں ان لوگوں کی طرح قربانیاں پیش کرنا ہوں گی، جنہوں نے غیر ملکیوں کے حملوں کا مقابلہ کیا اور اپنے وطن کی سرزمین کو غیر ملکیوں کے ناپاک قدموں سے محفوظ رکھنے کے لئے ہنسی خوشی اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے۔

تاہم ہماری اور ان کی کوششوں اور قربانیوں کی نوعیت مختلف ہے۔ ہمارے آباء واجداد نے میدان جہاد میں دشمن کے اسلحے کے مقابلے میں اپنا اسلحہ استعمال کیا اور یہ وقت کا تقاضا تھا، لیکن

(۱) ارضروم نامی شہر کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے۔

(۲) یہ ان ترکی خاتون کی بہادری کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے ۱۲۹۳ھ میں روس کے خلاف مشہور جنگ میں عثمانی فوجوں کی طرف سے بے مثال بہادری اور جرأت مندی کا مظاہرہ کیا وہ ارضروم نامی شہر میں پیدا ہوئیں اور ۹۸ سال کی عمر میں ۲۲ مئی ۱۹۵۵ء میں فوت ہوئیں۔ آپ کی تدفین ''عزیزیہ'' میں مقبرۃ الشھداء میں ہوئی۔

(۳) آپ جنگ آزادی کے پیش رؤں میں سے تھے۔ آپ نے ۱۳، اکتوبر ۱۹۱۹ء کو باپردہ عورتوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے والے فرانسیسی فوج کی وردی میں ملبوس لوگوں پر سب سے پہلے گولی چلائی۔

Marfat.com

آج ہمیں دشمن کے مقابلے کے لئے ان طریقوں اور اسالیب کو اختیار کرنا ہوگا جو وہ ہمارے خلاف استعمال کر رہا ہے۔ اپنے آباء و اجداد کی قربانیوں اور خون کو رائیگاں جانے سے بچانے کا یہی واحد محفوظ ترین راستہ ہے۔

لہٰذا اے مسلم نوجوانو! موجودہ حالات میں مقابلے کے اسالیب کے پیش نظر نیز اسلامی فکر کی ترویج اور عبادات میں نئی روح ڈالنے کے لئے خانقاہوں کے ساتھ ساتھ ایسے ادارے قائم کرنا تمہاری ذمہ داری ہے جو آج بھی وہی کارنامے سرانجام دے سکیں جو کبھی وہ ماضی میں سرانجام دیا کرتے تھے۔ان اداروں میں زیر تربیت افراد کے دلوں میں اسلام کی روح پھونکنے اور اسلامی شعور پیدا کرنے میں جتنی جلد ہو سکے اپنا تعاون فراہم کرو، کیونکہ روحانی تعلیمات سے محروم نسل کبھی بھی مثبت اور تعمیری کام سرانجام نہیں دے سکتی۔ متحرک اور فعال شخصیات کی تربیت کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے،لیکن اگر آپ نے منظم اور متعین مناہج و اسالیب کے مطابق جدوجہد جاری رکھی تو آپ کی نسل میں بھی امام ربانی، امام غزالی، شاہ نقشبند، محمد فاتح اور یاووز سلیم جیسے عظیم سپوت اور فارابی، ابن سینا، محی الدین ابن عربی اور مولانا جلال الدین رومی جیسے مفکرین اور اولیائے کرام پیدا ہو سکتے ہیں۔ آج بھی ہمارے گلستان میں اُن حضرات جیسے مہکتے پھول کھل سکتے ہیں۔ ضرورت صرف اِس بات کی ہے کہ باغبان اپنے کام میں ماہر ہو اور اپنی تمام صلاحیتیں اس مقصد کے لئے وقف کر دے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضروری ہونے کی ایک وجہ انسانوں کے باہمی حقوق بھی ہیں۔ اس ذمہ داری کا تعلق معاشرتی زندگی کے ساتھ ہے۔ اسی معاشرتی ذمہ داری کے باعث اسلامی ضابطہ اخلاق اور فکر کی ایسے طور پر تشکیل ممکن ہوئی کہ اس کے مطابق لوگ اپنی زندگیاں گزار سکیں اور اس کے اثرات معاشرے میں محسوس کئے جانے لگیں۔ جس طرح بازاروں میں طے پانے والے معاملات کے ناقابلِ تبدیل قوانین اس ذمہ داری کے ضمن میں آتے ہیں اسی

Marfat.com

طرح انسانوں کے باہمی حقوق بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔اس کی مزید وضاحت کچھ اس طرح ہے:

اسلام معیشت وتجارت کے بارے میں کچھ مخصوص اخلاقیات کا درس دیتا ہے۔ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تجارتی اور معاشی زندگی اخلاقیات کے اس فریم ورک کے اندر گزارے۔وہ سودی لین دین، ذخیرہ اندوزی اور تجارت کی حرام صورتیں اختیار نہیں کرسکتا۔اسے ہر غیر اخلاقی بات مثلاً مخصوص گروہوں کی حمایت اور درمیانے طبقے (Middle Class) کے وجود میں آنے کی مخالفت وغیرہ سے احتراز کرنا پڑتا ہے۔وہ تمام تجارتی معاملات میں توازن برقرار رکھنا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔جس چیز کو اسلام قبول نہ کرے اسے مسلمان بھی قبول نہیں کر سکتا۔اسے اپنی تجارتی سرگرمیوں کو دیرپا اور سودمند بنانے کے لئے جدوجہد جاری رکھنی چاہیے، بلکہ ایسا کرنے پر وہ کسی حد تک مجبور بھی ہے۔یہ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک پہلو ہے۔

مذکورہ بالا اصولوں پر عمل پیرا ہو کر مسلمان نہ صرف سود، ذخیرہ اندوزی اور کالے دھندے (Black Marketing) جیسی تجارتی برائیوں کا خاتمہ کر سکتے ہیں، بلکہ اُس ماحول کو بھی تبدیل کر سکتے ہیں، جس میں مذکورہ بالا برائیوں کو پنپنے کا موقع ملتا ہے۔

کسی بھی دوسرے نظام کی طرح اسلام بھی زندگی کے تمام شعبوں مثلاً تجارت، خاندان، معاشرتی تعلقات وغیرہ کے لئے اصول وضوابط پیش کرتا ہے۔مثلاً اسلام عائلی قانون کے طور پر نکاح کو ضروری قرار دیتا ہے، جس کی وجہ سے انسانی آبادی میں اضافہ ہوتا ہے۔اسلامی معاشرے میں زنا اور بے حیائی کی کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ اسلام معاشرتی زندگی کو نقصان پہنچانے والی ہر چیز کا سدباب کرتا ہے، جبکہ یہ دونوں برائیاں معاشرتی ڈھانچے کے لئے انتہائی خطرناک اور مہلک ثابت ہوتی ہیں۔

پھر خاندان کے اندر بھی افراد کے باہمی تعلقات کو اسلامی بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے۔اسلام خاندانی نظام کی حفاظت کے بارے میں انتہائی حساس ہے۔اس لئے اسلام خاندانی

Marfat.com

نظام کے لئے نقصان دہ افکار کی راہ میں سد سکندری کی طرح حائل ہو جاتا ہے۔ خاندانی نظام کی حفاظت اور انسانی نسل کو ضیاع سے بچانے کے لئے اس قدر اہتمام ناگزیر ہوتا ہے۔

ایک مسلمان جہاں اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی میں اسلام کے احکامات پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتا ہے وہیں وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلام میں ممنوع اور حرام کردہ امور سے بچنے کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ یہ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک پہلو ہے۔

ایک مسلمان جس طرح مذکورہ بالا مختلف طریقوں سے اپنی زندگی اسلام کے احکامات کے مطابق گزارنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح وہ اپنے گردوپیش کے معاشرے میں بھی ان خوبیوں کو عام کرنے کی جدوجہد میں لگا رہتا ہے۔ ایسے شخص کو ہی ہم کامل اور باکمال انسان کہہ سکتے ہیں۔ ایسے باکمال افراد اور امت سے باکمال معاشرہ جنم لیتا ہے اور آخرکار ایسے بہت سے باکمال معاشروں اور قوموں کے امتزاج سے باکمال دنیا وجود میں آتی ہے۔ آج انسانیت مسلمانوں کی بسائی ہوئی خوشنما دنیا کی منتظر ہے، لیکن اس قسم کی دنیا کا بسانا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی پر منحصر ہے۔ وہ دنیا جسے دیکھنے کے لئے ہماری آنکھیں ترس رہی ہیں، اُس کا ہر ایک فرد دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی فکر میں لگا رہے گا اور ہر قوم چاہے گی کہ اس دنیا کو اپنے اور دیگر اقوام کے لئے قطعہ جنت نظیر بنا دے۔ بھلائی کے کاموں میں مسابقت اس دنیا کی بنیادی خصوصیت ہوگی۔ جس معاشرے یا دنیا میں بھلائی کے کاموں میں مسابقت ہونے لگے، اس میں ''میں'' کی بجائے ''ہم'' کا استعمال زیادہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ خود غرضی ختم ہو جاتی ہے، جو شاعر کے اِس شعر سے جھلکتی ہے: ''اگر میں پیاس سے مر جاؤں تو میرے بعد بیشک بارش نہ برسے''۔ ایسی خود غرضی اُس معاشرے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ یہ نظریہ پروان چڑھتا ہے: ''اگر کسی شخص کے نصیب میں پیاسا مرنا ہے تو وہ شخص مجھے ہی ہونا چاہئے''۔ ایسا معاشرہ ہی پھلتا پھولتا اور ترقی پاتا ہے۔ ایسے معاشرے کے ہر ہر فرد کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ خوش رہیں اور وہ ان کو دیکھ کر خوش ہوتا رہے۔ خوش ہونے والوں میں اس کا نمبر سب سے آخر میں آئے۔ یہ سوچ پورے معاشرے کی مشترکہ سوچ بن

Marfat.com

جاتی ہے اور اسی کی بنیاد پر معاشرے کے افراد باہمی طور پر مربوط رہتے ہیں۔ دوستی اور محبت کے جذبات سے ہر ایک سرشار رہتا ہے۔ ایسے پاکیزہ ماحول میں رہتے ہوئے دشمنی اور عداوت کو ہر کوئی بھول جاتا ہے۔

دراصل مذکورہ بالا تمام خصوصیات ہماری روحانی ترقی کے ضامن اسلامی نظام کا حصہ ہیں۔ اگر لوگ اس نظام کو سمجھ کر اس کے مطابق اپنی روحانی تربیت کرنے لگیں تو جس قدر وہ تربیت لیتے جائیں گے اسی قدر باکمال معاشرہ وجود میں آتا جائے گا۔

تاہم اِس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ تمام دنیا اِن نتائج کا ادراک کرے، انہیں سمجھے اور عملی زندگی میں ان کا مشاہدہ کرے۔ یہ خواب بھی اِمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے ہی شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے، لیکن ابھی تک یہ فریضہ انفرادی، خاندانی اور اجتماعی سطح پر رجالِ کار کی توجہ کا منتظر ہے۔

۶۔ دعوت وتبلیغ اور فرد و معاشرے کا باہمی تعلق

رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ہے:

"اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ"

"حقیقی مسلمان وہ شخص ہے، جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں"(1)

اس حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان سے یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی بھی دوسرے انسان کے مال، عزت وآبرو، نیک نامی یا جان کو نقصان پہنچائے۔ اگر صرف خاوند کو عورت کے ستر کے اعضاء کو چھونے کی اجازت ہے تو کیا اس سے یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ کسی اور مرد کے لئے بھی اس عورت کے ساتھ ایسا تعلق قائم کرنا جائز ہوگا؟ نیز اگر کوئی عورت بے پردہ اور ستر کے اعضاء کو کھول کر گھومتی پھرتی ہے تو یہ اس کی ذات تک محدود گناہ ہے، لیکن اس سے کسی غیر محرم کے لئے اسے دیکھنے کا جواز فراہم نہیں ہوتا۔ اگر مسلمان ایسے امور میں اتنی حساسیت اور دقت نظر کا مظاہرہ کریں تو کیا وہ بدنظری سے بڑے گناہوں کا ارتکاب کریں گے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ انفرادی واقعات ہر معاشرے میں رونما ہوتے رہتے ہیں، لیکن یہاں قصداً حدود سے تجاوز کرنے کی بات ہو رہی ہے۔

(1) البخاری: الایمان، ٤۔٥؛ مسلم: الایمان، ٦٥؛ ابو داؤد: الجهاد، ٢

Marfat.com

میں بعض ایسے نوجوانوں کو جانتا ہوں کہ اگر بضرورت بازار میں چلتے ہوئے، ان سے بدنظری ہو جائے تو وہ توبہ کی غرض سے اپنے روزانہ کے جیب خرچ میں سے کچھ رقم اس گناہ کے کفارے کے طور پر صدقہ کرتے ہیں۔ ہر مسلمان کو اِس طرح کے اخلاق سے مزین ہونا چاہئے۔ کیونکہ مسلمان وہی شخص کہلا سکتا ہے، جس سے دوسرے مسلمان مطمئن اور بے خوف رہیں۔ ایک مسلمان کسی دوسرے شخص کے ایک لقمے کی طرف بھی اپنا ہاتھ دراز نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی دوسرے کے پوری زمین کے برابر سونے میں سے ایک گرام بھی لینے کا خیال اُس کے دل میں گزر سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان امانت دار اور بااعتماد انسان ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ ایسے ہی افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ کسی بھی انسان کو ایسے معاشرے سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مذکورہ بالا حدیث شریف کے مفہوم مخالف سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر وہ شخص ہے، جس کی زبان اور ہاتھ کے شر سے دوسرے لوگ محفوظ نہ ہوں، چونکہ بے دینوں میں امن اور سکون کا شعور نہیں ہوتا، اس لئے اگر آج انسانیت بے دین لوگوں سے خوف زدہ اور پریشان ہے تو وہ حق بجانب ہے اور تاریخی واقعات اس حقیقت پر گواہ ہیں، جبکہ اسلام اپنے پیروکاروں کی ایسے عمدہ اخلاق کے مطابق تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنی روحانی تربیت اور کردار کی وجہ سے دوسری اقوام سے ممتاز نظر آتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو کہ جس معاشرے میں مسلمان پروان چڑھتا ہے اس میں اخلاقی بے راہ روی کے تمام ذرائع کا سدباب کر دیا جاتا ہے اور جن امور کو دین "منکرات" قرار دیتا ہے انہیں اسلامی معاشرے میں بھی برائی تصور کیا جاتا ہے۔ اس لئے جن معاشروں میں مسلمان نشوونما پاتے ہیں، اُن سے روح اور ایمان کی خوشبو پھوٹتی ہے، جس کی وجہ سے وہ ان تمام معاشروں سے ممتاز نظر آتے ہیں، جن میں برائیوں کا دور دورہ ہوتا ہے۔ البتہ یہ مسلمان کے فرائض میں شامل ہے کہ پہلے وہ خود اپنے اندر عمدہ عادات پیدا کرے اور پھر انہیں دوسروں کی طرف منتقل کرے۔

اس فریضے کو سب سے پہلے انفرادی، پھر اجتماعی اور پھر ملکی سطح پر سرانجام دینا چاہئے۔ روشن خیال معاشرہ روشن خیال افراد سے ہی تشکیل پاتا ہے۔ ایسی کیفیت سے نہ صرف افراد متاثر

Marfat.com

ہوتے ہیں، بلکہ دوسرے گروہ اور اقوام بھی اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔ شاید اس صداقت کلیہ کی بہترین مثال نجاشی کے قبول اسلام کا واقعہ ہے۔

نجاشی حبشہ کا حکمران تھا۔ مسلمانوں کی ایک جماعت نے اس سے پناہ مانگی تو اس نے انہیں پناہ دے دی۔ وہ ان کی باتوں اور کردار کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اُن کی پیشانیوں کی نورانیت اور ان کے دلوں میں موجود ایمان کی بدولت حقیقت تک اُس کی رسائی ہوگئی اور وہ رسول اکرم ﷺ پر فوراً ایمان لے آیا۔ جہاں یہ نجاشی کے محل میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی کا کرشمہ تھا وہیں یہ نجاشی کے سامنے کہی جانے والی باتوں پر پہلے خود عمل پیرا ہونے کا نتیجہ بھی تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ نجاشی جس قدر اُن کی باتوں سے متاثر ہوا تھا اسی قدر اسے ان کے کردار اور روحانی حالات سے پھوٹنے والے اخلاق بھی پسند آئے۔

نجاشی نے جو خط رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا وہ سراپا ادب سے عبارت ہے۔ اس خط کی ابتداء یوں ہوتی ہے: "اِلٰی مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰہِ مِنَ النَّجَاشِی۔۔۔" اُس نے آپ ﷺ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے آپ ﷺ کے نام کو اپنے نام سے پہلے لکھا۔ خط میں اور بھی بہت سے الفاظ آپ ﷺ کی عظمت اور احترام پر دلالت کرتے ہیں۔ اچانک ہی اس کی روح میں ایمانی موجوں کا کس قدر تلاطم پیدا ہو گیا ہوگا؟ انہی خوبیوں کی وجہ سے یہ خط بار بار پڑھے جانے کے لائق ہے۔

نجاشی کی یہ بات کتنی عظمت کی حامل ہے: "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔۔۔ میں صرف اپنی ذات کا مالک ہوں۔ اے اللہ کے رسول ﷺ اگر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکتا تو ایسا ضرور کرتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ جو کچھ آپ ﷺ فرماتے ہیں وہ حق ہے۔۔۔"(1)

ایک اور موقع پر وہ بڑی حسرت سے کہتا ہے: "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے آپ ہی کی خوشخبری سنائی تھی۔ اگر مجھ پر امورِ سلطنت کا بار

(1) ابن کثیر: البدایۃ والنہایۃ، ۳/۱۰۵

Marfat.com

نہ ہوتا تو آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کے نعلین مبارک اٹھاتا...(۱)

نجاشی کی زندگی میں یہ انقلاب صحابہ کرامؓ کی اُس جماعت کی اسلامی زندگی اور ان کے لبوں سے لعل و گوہر کی طرح جھڑنے والے قیمتی اور پاکیزہ کلمات کی بدولت رونما ہوا تھا۔ کتابوں میں یہ واقعہ درج ذیل الفاظ میں مذکور ہے:

جب مکہ کی زمین مسلمانوں پر تنگ کردی گئی اور کسی بھی مسلمان کی جان، مال اور عزت و آبرو محفوظ نہ رہی تو مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت ملی۔ مسلمانوں کی ایک جماعت نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ وہاں توقعات سے بڑھ کر اُن کا معزز مہمانوں کی طرح استقبال کیا گیا، لیکن مشرکین مکہ کو یہ بات کہاں گوارا تھی۔ انہوں نے تو مسلمانوں پر روئے زمین تنگ کئے رکھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ چنانچہ انہوں نے باہمی مشورہ کرکے نجاشی کو مسلمانوں کی حمایت سے دست بردار کرنے اور مسلمانوں کی امیدوں پر پانی پھیرنے کے لئے ماہر سیاسیات عمرو بن العاص (جو بعد میں بڑے صحابہ میں شمار ہوئے) کی سربراہی میں اپنا ایک وفد حبشہ روانہ کیا۔

نجاشی نے کچھ دیر اُن کی بات غور سے سنی۔ اِس دوران انہوں نے نجاشی کے جذبات پر اثر انداز ہونے کے لئے اپنے سارے الزامات اور بہتان اس کے سامنے پیش کردیے، لیکن نجاشی بہت ہی صاحبِ مروت انسان تھا۔ اس نے محض بے بنیاد اور بے وقعت الزامات کی بنیاد پر اپنی پناہ سے دستبرداری کا اعلان نہیں کیا۔ اس نے قریش کے وفد سے واضح الفاظ میں کہا کہ وہ فریقِ ثانی کا مدعا سنے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرے گا۔ چنانچہ کچھ مسلمانوں کو نجاشی کے محل میں بلایا گیا جن کی سربراہی حضرت جعفر بن ابی طالب کر رہے تھے۔ مسلمانوں نے آپ کو اپنے نمائندے کے طور پر منتخب کیا تھا۔

آپ کا شمار شرفائے مکہ میں ہوتا تھا۔ آپؓ رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی تھے۔ مسلمانوں کا انہیں اپنا نمائندہ منتخب کرنا ان کے باہمی اتحاد و اتفاق کی

(۱) ابو داؤد: الجنائز، ٥٦؛ سعید بن منصور: السنن، ٢/٢٢٨؛ المسند: ١/٤٦١؛ حاکم: المستدرک، ٢/٣٣٨

Marfat.com

علامت تھی۔ صحابہ کرام کا ایسا مضبوط باہمی تعلق دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کا باعث بنا ہوا تھا۔

بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے والوں پر بادشاہ کے سامنے سجدہ تعظیمی بجالانا ضروری تھا۔ اسے دربار کے اہم ترین آداب میں سے سمجھا جاتا تھا، لیکن چونکہ مسلمان اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا جائز نہیں سمجھتے، اس لیے انہوں نے بادشاہ کے سامنے سجدہ نہیں کیا۔ مشرکین کا وفد یہ سوچ کر کہ اب نجاشی مسلمانوں سے ناراض ہو کر انہیں اپنے دربار سے نکال دے گا، مسلمانوں کے اِس طرزِ عمل پر خوش ہو رہا تھا، لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ نجاشی عمدہ اخلاق کا نمونہ تھا اس نے ایسا نہ کیا۔ کاش! آج جمہوریت کا دعویٰ کرنے والے بھی اُس جمہوریت کو اپناتے، جس کا مظاہرہ حبشہ کے بادشاہ نے چودہ صدیاں پہلے کیا تھا۔ کاش! اِن لوگوں کے دعووں میں کچھ حقیقت کا عنصر بھی شامل ہوتا۔

نجاشی نے مسلمانوں سے چند سوالات پوچھے، جن کا جواب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے درج ذیل الفاظ میں دیا:

''اے بادشاہ! ہم جاہل قوم تھے۔ بتوں کی پوجا کیا کرتے، مردار کھایا کرتے، بے حیائیوں کا ارتکاب کیا کرتے، قطع رحمی کرتے اور پڑوسیوں کے ساتھ برا سلوک روا رکھتے تھے۔ ہم میں سے طاقتور کمزوروں پر ظلم ڈھایا کرتا تھا۔ ہماری یہی حالت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف ہم میں سے ہی ایک رسول بھیجا، جس کے حسب ونسب، صداقت، امانت داری اور پاکدامنی سے ہم بخوبی واقف تھے۔ اس نے ہمیں اللہ کو ایک ماننے، اسی کی عبادت کرنے اور پتھر کے بتوں کی پوجا چھوڑ دینے کی دعوت دی۔ اس نے ہمیں سچ بولنے اور حرام کاموں اور خون ریزی سے باز رہنے کا حکم دیا۔ اس نے ہمیں بے حیائی، جھوٹ بولنے، یتیموں کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں پر بہتان طرازی سے منع کیا۔ اس نے ہمیں صرف ایک اللہ کی عبادت کرنے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانے، نماز پڑھنے، زکوٰۃ ادا کرنے اور روزہ رکھنے کا بھی حکم دیا۔

Marfat.com

نجاشی کے سامنے اسلام کے دیگر احکام بھی بیان کرنے کے بعد حضرت جعفر نے کہا: ''ہم نے اس کی تصدیق کی، اس پر ایمان لائے اور اس کے بتائے ہوئے احکامات کی پیروی کرنے لگے۔ ہم نے صرف ایک اللہ کی عبادت شروع کی، اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرایا۔ جو چیزیں اس نے ہم پر حرام قرار دیں ہم نے انہیں حرام سمجھا اور جنہیں اس نے حلال قرار دیا، ہم نے بھی انہیں حلال سمجھا، لیکن ہماری قوم ہمارے درپے ہوگئی۔ انہوں نے ہمیں تکلیفیں پہنچائیں اور ہمارے دین کی وجہ سے ہمیں آزمائش میں ڈالا، تا کہ ہم ایک اللہ کی عبادت چھوڑ کر بتوں کی پوجا کی طرف لوٹ آئیں اور جن بری باتوں کو پہلے حلال سمجھتے تھے انہیں پھر سے حلال سمجھنے لگیں۔ جب انہوں نے ہم پر حد سے زیادہ دباؤ ڈالا، ظلم و ستم کی انتہا کر دی، ہمارے لئے مشکلات پیدا کیں اور ہمارے اور ہمارے دین کے درمیان حائل ہوگئے تو ہم آپ کے ملک کی طرف نکل آئے۔ ہم نے دوسروں کی بہ نسبت آپ کو ترجیح دی اور آپ کے پڑوس کو پسند کیا۔ اے بادشاہ سلامت! ہمیں امید ہے کہ آپ کے ہاں ہمیں کسی قسم کے ظلم کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔''(۱)

اس کے بعد بھی حضرت جعفرؓ نے اپنی گفتگو جاری رکھی اور نجاشی اُن کی باتیں غور سے سنتا رہا۔ نجاشی نے ان سے حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم علیہما السلام کی بابت دریافت کیا تو انہوں نے اس کے سامنے انتہائی خشوع کے ساتھ سورتِ مریم کی تلاوت کی۔ جسے سن کر نجاشی اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا نجاشی اپنا ہاتھ زمین کی طرف لے گیا اور زمین سے ایک چھوٹا سا تنکا اٹھا کر کہا: ''جو کچھ تم نے حضرت عیسیٰ ابن مریم کے متعلق کہا ہے وہ اُس سے اِس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں۔''(۲) یقیناً حقیقت ایسے ہی ہے۔ کیونکہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام پر نازل

(۱) المسند: ۱/۲۰۱ـ۲۰۲؛ سیرة ابن هشام: ۱/۳۵۸ـ۳۶۲؛ ابن کثیر: البدایة، ۳/۸۸؛ ابو نعیم: الدلائل، ۱/۲۴۳ـ۲۵۳؛ البیهقی: الدلائل؛ ۲/۳۰۱ـ۳۰۳

(۲) المسند: ۱/۲۰۱ـ۲۰۲؛ سیرة ابن هشام: ۱/۳۵۸ـ۳۶۲؛ ابن کثیر: البدایة، ۳/۸۸؛ ابو نعیم: الدلائل، ۱/۲۴۳ـ۲۵۳؛ البیهقی: الدلائل، ۲/۳۰۱ـ۳۰۳

Marfat.com

ہونے والی وحی کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔

نجاشی نے مشرکین کے وفد کو بمع اُن کے تحائف کے واپس لوٹا دیا اور مسلمانوں کی حمایت کا اعلان کر دیا، کیونکہ اس نے اس مختصر سی ملاقات میں مسلمانوں کے عمدہ اخلاق کا مشاہدہ کر لیا تھا، جو اس کے قبول اسلام کے لئے کافی تھا۔

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ جب تک اس مقدس اور عالی مرتبت فریضے کو انفرادی سطح پر ادا نہیں کیا جائے گا اس وقت تک ایک مکمل معاشرے کا قیام محض خواب رہے گا، چونکہ فرد اور معاشرے کے درمیان گہرا تعلق پایا جاتا ہے اور افراد سے ہی معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے، اس لئے مکمل معاشرہ وہی معاشرہ ہو سکتا ہے، جس کے افراد باکمال ہوں۔ ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح افراد کو اپنے کمالات کی حفاظت کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح معاشروں کو بھی پہلے سے موجود کمالات کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے نیز جیسا کہ پہلے گزر چکا کہ فضائل کی جو باتیں انسان اپنے اندر پیدا کرتا ہے وہ ازلی ہوتی ہیں اور نہ ہی ابدی، بلکہ ان کا دوام ان شرائط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے، جن کے ذریعہ سے انسان انہیں حاصل کرتا ہے۔ انبیائے کرام کے علاوہ کسی انسان کی فضیلت کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ البتہ انبیائے کرام فضیلت کی باتوں کے حصول کے لئے جو بے پناہ جدوجہد کرتے ہیں، اس کے عوض انہیں اس بات کی ضمانت فراہم کر دی جاتی ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنے ازلی علم کے ذریعے پہلے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مستقبل میں فضیلت کے کن درجات تک پہنچیں گے، اس لئے انہیں خدائی انعام کے طور پر پہلے سے ہی عصمت کی ضمانت فراہم کر دی جاتی ہے، جبکہ انبیائے کرام کے علاوہ دیگر لوگوں کا مقام و مرتبہ خواہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، انہیں اپنے حاصل کردہ مقام کی حفاظت کرنا پڑتی ہے ورنہ انجام کار ناکامی اور انحطاط کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ امر بالمعروف کے ذریعے فرد اور معاشرے میں جو خوبیاں پیدا ہوتی ہیں ان کی حفاظت اور دوام بھی امر بالمعروف کے ذریعے ہی ممکن ہے، ورنہ بتدریج انحطاط اور زوال کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو اس معاشرے کے مکمل خاتمے پر منتج

Marfat.com

ہوتا ہے۔ایسے انجام بد سے بچنے کے لئے روحانی قوت کو بڑھانے اور دائمی طور پر متحرک رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، جس کا ذریعہ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی ہے۔حاصل یہ کہ یہ مقدس فریضہ جہاں فرد اور معاشرے، دونوں کے لئے زندگی کی حیثیت رکھتا ہے وہیں یہ زندگی کی بقا کے لئے بھی شرط ہے۔شاید اسی وجہ سے سید المرسلین ﷺ نے بعض صحابہ سے بیعت لیتے وقت امر بالمعروف کی شرط لگائی تھی۔مثلاً آپ ﷺ نے حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کے وقت جو شرط لگائی تھی وہ حسب ذیل ہے:

بَايَعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى اِقَامِ الصَّلَاةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكَاةِ وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ"

"میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھنے، زکوٰۃ ادا کرنے اور ہر مسلمان کے ساتھ خیرخواہی کرنے کی شرط پر بیعت کی۔"(۱)

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ تم پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی ضروری ہے، نیز اس مقدس فریضے کی بدولت انسان میں دیگر خوبیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں، کیونکہ جو شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتا ہے اور اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر دیتا ہے، وہ پہلے اپنے آپ کو ان خوبیوں سے مزین کرتا ہے، جن کی وہ دوسروں کو ترغیب دیتا ہے اور ہر وقت کسی نہ کسی خوبی کو اختیار کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔داعی سب سے مشکل اور بوجھل کام سرانجام دیتا ہے، جو نہ صرف انبیائے کرام کا کام ہے، بلکہ اُن کی زندگیوں کا مقصد ہے، اسی لئے داعی کا مرتبہ بھی بہت بلند ہے۔

حضرت لقمان کی طرف سے اپنے بیٹے کو کی جانے والی نصیحتوں کے ضمن میں قرآن کریم اس مقدس فریضے کے مشکل ہونے کی طرف درج ذیل الفاظ میں اشارہ کرتا ہے:

" يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔" [لقمان:۱۷]

(۱) البخاری:الایمان،۴۲؛مسلم:الایمان،۹۷؛الترمذی:البر والصلة،۱۷؛الدارمی:البیوع،۹

Marfat.com

''بیٹا نماز کی پابندی رکھنا اور (لوگوں کو) اچھے کاموں کے کرنے کا امر اور
بری باتوں سے منع کرتے رہنا اور جو مصیبت تجھ پر واقع ہو اس پر صبر کرنا۔
بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لقمان علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے بیٹے کو نماز کی ادائیگی کی وصیت کی اور پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی نصیحت کی۔ گویا وہ اپنے بیٹے سے یہ کہنا چاہ رہے ہیں: ''اے میرے پیارے بیٹے! جو نماز نہیں پڑھتا اس کی کوئی جدوجہد مقبول نہیں۔ نماز تمام عبادات کی قبولیت کے لئے شرط ہے۔ اس لئے پہلے تو تم خود اس بندگی کو خدا کے حضور بجا لاؤ اور پھر اپنے ماحول میں نیکی کی اشاعت اور برائیوں سے روکنے کے لئے اپنی تمام تر توانائی خرچ کر ڈالو۔ اس جدوجہد کے دوران تمہیں طرح طرح کی مشکلات و تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا، جن کا ابتداء سے ہی صبر و تحمل کے ساتھ سامنا کرنا۔''

کسی بھی صاحب دعوت پر مشکلات و مصائب کا آنا کوئی انوکھی بات نہیں۔ ہمیشہ سے ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یہ بالکل متوقع صورتِ حال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ انتہائی عالی شان کام ہے جسے صرف بلند حوصلہ لوگ ہی سرانجام دے سکتے ہیں۔ ان کی اس جدوجہد کا بدلہ بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی دے سکتے ہیں۔ جو لوگ اس عالی مرتبت فریضے کو سرانجام دیں گے، اللہ تعالیٰ انہیں اولوالعزم لوگوں کی معیت عطا فرمائیں گے، لیکن اس کے لئے انہیں ان مشکلات و مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑے گا جو عظیم لوگوں کو پیش آتے ہیں اور انہیں اُسی حوصلے اور صبر کے ساتھ برداشت کرنا ہوگا جو اولوالعزم لوگوں کا شیوا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس جلیل القدر فریضے کی اہمیت درج ذیل حدیث میں بیان فرمائی ہے: ''میری امت کے بہترین لوگ وہ ہیں جو جاہل لوگوں کے درمیان آزمائش وجدوجہد کی زندگی بسر کرتے ہیں۔''(۱) اس مضمون کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے:

'' اَلْمُسْلِمُ اِذَا کَانَ مُخَالِطُ النَّاسَ وَیَصْبِرُ عَلٰی اَذَاھُمْ اَعْظَمُ اَجْرًا

(۱) الدیلمی: الفردوس، ۲/۱۷۴

Marfat.com

مِنَ الْمُؤْمِنِ الَّذِی لَایُخَالِطُ النَّاسَ وَلَا یَصْبِرُ عَلٰی اَذَاهُمْ"

"جو مسلمان لوگوں کے ساتھ میل جول رکھتا ہے اور اُن کی ایذا رسانی پر صبر کرتا ہے وہ ایسے مسلمان سے بہتر ہے، جو نہ تو لوگوں کے ساتھ میل جول رکھتا ہے اور نہ ہی ان کی ایذاء رسانی پر صبر کرتا ہے۔"(۱)

ایک بگڑے ہوئے معاشرے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری ادا کرنا معاشرے سے دور کسی خانقاہ میں بیٹھ کر انفرادی عبادت کرنے سے افضل ہے۔ اگر یہ فریضہ انفرادی عبادات سے افضل نہ ہوتا تو رسول اکرم ﷺ اپنے گھر کو چھوڑتے اور نہ لوگوں سے زیادہ میل جول رکھتے بلکہ خدائی تجلیات وانوار میں مشغول رہتے، نیز اگر یہ فریضہ دیگر تمام عبادات خصوصاً گوشہ نشینی سے بہتر نہ ہوتا تو حضور ﷺ کو قرآن کریم میں یوں خطاب نہ کیا جاتا:

"یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝" [سورۃ المدثر: ۲-۱]

"اے (محمد) جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو۔ اٹھو اور ہدایت کردو۔"

دین سراپا خیر خواہی ہے۔ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دوسرا نام ہے۔ ایک دفعہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "دین سراسر خیر خواہی ہے۔" صحابہ نے عرض کیا: "کس کے لئے؟" آپ ﷺ نے جواب دیا: "اللہ، اس کی کتاب، اس کے رسول، مسلمان کے حکمرانوں اور عام مسلمانوں سب کے لئے۔"(۲)

دعوت الی اللہ ایک مسلمان کا بنیادی مقصد ہے، جسے وہ بغیر کسی توقف کے سرانجام دیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس مقصد کے لئے فارغ کر دیتا ہے، یہاں تک کہ اس کا جو دن دعوت الی اللہ کے بغیر گزر جائے اس دن اس کی نیند اڑ جاتی ہے اور بھوک ختم ہو جاتی ہے۔ اس دن کو وہ اپنی زندگی کا حصہ قرار دینا بھی پسند نہیں کرتا۔

---

(۱) الترمذی: القیامة، ۵۵؛ ابن ماجه، الفتن، ۲۳؛ المسند: ۴۳/۲

(۲) مسلم: الایمان، ۹۵؛ البخاری: الایمان، ۴۲؛ ابو داؤد: الأدب، ۵۹؛ الترمذی: البر والصلة، ۱۷، النسائی: البیعة، ۳۱

Marfat.com

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ سے لوگوں کو متعارف کرانا اس کا ہر وقت کا مشغلہ بن جاتا ہے۔ وہ ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ کو دعوت الی اللہ کی خاطر پیش آنے والی مشکلات و تکالیف کا اس قدر تذکرہ کرتا ہے کہ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے سامعین رسول اکرم ﷺ کی سیرت کو اپنی تمام سرگرمیوں کے لئے اُسوہ بنالیں گے۔

اسی طرح وہ قرآن کریم سے بھی لوگوں کو روشناس کراتا ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے دستورِ حیات اور رہنما بنا کر نازل کیا ہے۔ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ ہماری عزت وحشمت قرآن کریم پر عمل پیرا ہونے میں مضمر ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے جب بھی قرآن کریم کو مضبوطی سے تھاما اور اس کی تعلیمات کی پیروی کی وہ ترقی کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے اور اس کے برعکس جب اس سے روگردانی کی تو امت کا شیرازہ بکھر گیا۔

یہاں میں ایک حقیقت کی طرف دلی حسرت کے ساتھ اشارہ کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ دلی حسرت اس لئے ہے کہ میں جب بھی اس معاملے پر غور کرتا ہوں تو مجھے شدید دکھ ہوتا ہے۔

آج کے مسلمانوں کو قرآن کریم کی کوئی سمجھ بوجھ نہیں۔ وہ قرآن کریم سے بالکل لاتعلقی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ قرآن کریم کے ساتھ اُن کا تعلق محض رسمی سا رہ گیا ہے۔ جو شخص قرآن کریم کو احترام کے ساتھ سینے سے اوپر نہ اٹھانے کو بے ادبی سمجھتا ہے اس کی عملی زندگی میں قرآنی تعلیمات کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی، لیکن یاد رکھیے! جو شخص قرآن کریم کو اپنا دستورِ حیات اور اس کی تعلیمات کی پیروی کو زندگی کا مقصد نہیں بناتا وہ روزِ قیامت کے دردناک عذاب سے خلاصی نہیں پا سکتا، خواہ وہ کوئی بھی ہو اور اس کا مرتبہ کتنا ہی بلند ہو اور وہ دنیا میں قرآن کریم کو عمدہ غلافوں میں لپیٹ کر اونچے اونچے طاقچوں میں کیوں نہ رکھتا ہو، بلکہ ہو سکتا ہے کہ قیامت کے دن اسے بھی دنیا میں قرآن کی مخالفت اور گناہوں کے ارتکاب کی پاداش میں گردن یا ٹانگوں سے باندھ کر لٹکا دیا جائے۔

کاش! غیب کا پردہ تھوڑی دیر کے لئے اٹھ جاتا کہ یہ واعظین، مفتیان، مصنفین، لکھاری، مفکرین، قراء، معلمین اور سامعین قرآن سے اپنی دوری اور اسے چھوڑ دینے کے انجام کا مشاہدہ کر لیتے... لیکن ایسا صرف اس لئے نہیں ہوتا کہ قصد وارادے کی آزادی کو چھیننا آزمائش وامتحان کے مقصد کے منافی ہے۔

Marfat.com

ابھی ہم نے آخرت کے احوال کا مشاہدہ کرنے کے لئے غیب کے پردوں کے اٹھائے جانے کا ذکر کیا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے دنیوی انجام کے ادراک کے لئے تھوڑا سا غور و فکر بھی کافی ہے۔ کیا یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح نہیں کہ قرآن کریم سے دوری اختیار کر کے ہم اپنی بقا کی قیمت کس کو اور کیسے ادا کر رہے ہیں؟ اس ذلت و رسوائی کے بعد کون سی ذلت و رسوائی ہو گی جو ہمارے قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا ذریعہ بن سکے؟ اس تکلیف دہ صورت حال کو ختم ہونا چاہئے اور مسلمانانِ عالم کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہماری نجات کا واحد راستہ قرآنی تعلیمات کی پیروی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو صرف یہی بات سمجھانے کے لئے مبعوث کیا گیا تھا۔ انسانیت جس قدر قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہوگی اس کا مرتبہ اسی قدر بلند ہوگا۔

حاصل یہ ہے کہ انفرادی سطح پر جب کوئی انسان اس مقدس فریضے کو ادا کرتا ہے تو ایمان سے سرشار آواز سے دوسرے بہت سے لوگوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کا باعث بن جاتا ہے اور ان سب کا ثواب اس کے اعمال نامہ میں لکھا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ چونکہ تم نے ایک شخص کو نماز کی اہمیت، زکوٰۃ کے وجوب، روزے کی حکمت اور دعوت و تبلیغ کی ضرورت وغیرہ کا قائل کیا ہے اس لئے حال و مستقبل کے اس کے تمام نیک کاموں کا ثواب تمہارے اعمال نامہ میں بھی لکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جوامع الکلم عطا کئے تھے، آپ ﷺ نے مذکورہ بالا مضمون ایک مختصر سے جملے میں یوں ارشاد فرمایا:

(إِنَّ الدَّالَّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهِ)(۱)

”بھلائی کی طرف رہنمائی کرنے والا اس کے کرنے والے کی طرح ہوتا ہے۔“

اس سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک چھوٹا سا کام کس قدر اجر و ثواب کا باعث بن جاتا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ”جو شخص اسلام میں کوئی اچھی بات جاری کرتا ہے جس پر اس کے بعد بھی عمل ہوتا ہے تو جتنے بھی انسان اس پر

---

(۱) الترمذی: العلم، ۱۴

Marfat.com

عمل کریں گے ان کا ثواب اس اچھی بات کو جاری کرنے والے کے اعمال نامہ میں لکھا جاتا رہے گا اوران عمل کرنے والے لوگوں کے ثواب میں بھی کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور جو شخص اسلام میں کسی بری بات کا آغاز کرے گا، جس پر اس کے بعد بھی عمل ہوتا رہا تو جتنے بھی لوگ اس پر عمل کریں گے ان سب کا گناہ اس بری بات کو جاری کرنے والے شخص کے اعمال نامہ میں لکھا جاتا رہے گا اوران عمل کرنے والے لوگوں کے گناہوں میں بھی کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔"(۱)

چونکہ کسی اچھی بات کا آغاز کرنا بے جان معاشرے کے بدن میں نئی روح پھونکنے کے مترادف ہے، اس لئے جتنے لوگ بھی اس اچھی بات پر عمل کریں گے اس اچھی بات کو جاری کرنے والے کو اس کا ثواب ملتا رہے گا، خواہ وہ لوگ اس کے رشتہ دار ہوں یا اجنبی اور ہمارے اس دنیا سے کوچ کر جانے کے بعد بھی وہ نیکیاں ہمارے نامہ اعمال میں لکھی جاتی رہیں گی۔ دوسری نیکیوں کو بھی اس پر قیاس کر لینا چاہیے۔

ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ایک دن لوگ ہمارے مردہ جسم کو چارپائی پر اٹھا کر قبر میں رکھ آئیں گے اور اس پر منوں مٹی ڈال دیں گے۔ ہمارے قریبی رشتہ دار ماں، باپ، بہن، بھائی اور دوست احباب ہمیں وہاں اکیلا چھوڑ کر واپس چلے آئیں گے۔ اس وقت ہمارا توشہ وہی نیکیاں ہوں گی جنہیں ہم اپنی زندگی میں جاری کر آئے ہوں گے۔ ان کے ثواب سے ہماری قبر بقعہ نور بن جائے گی اور ہم جسمانی طور پر مردہ ہونے کے باوجود دنیا میں اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے اعمال کی بدولت قیامت تک زندہ رہیں گے۔

ذرا سوچئے! حضرت محمد ﷺ کو اس دنیا سے کوچ کئے ہوئے چودہ صدیاں گزر چکی ہیں لیکن کون ہے جو آپ ﷺ جیسی زندگی سے لطف اندوز ہو رہا ہوگا؟ روزانہ آپ ﷺ کے اعمال نامے کے نئے نئے رجسٹر کھلتے ہیں اور پھر کبھی بند نہیں ہوتے۔ ان میں آپ ﷺ کے لئے اجر و ثواب لکھا جاتا ہے۔ آپ ﷺ کے بعد اُن معمارانِ انسانیت کا مقام ہے، جنہوں نے اجتماعی زندگی کی تعمیر میں کسی نہ

(۱) مسلم: العلم، ۱۶؛ الترمذی: العلم، ۱۵؛ المسند: ۴/ ۳۶۱

Marfat.com

کسی درجے میں حصہ لیا۔ ایسے لوگوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے، ان میں سے ہر ایک کسی نیک کام کے جاری کرنے میں جس قدر وسیلہ بنا اسی قدر اجر وثواب کا مستحق قرار پایا۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی رحمت بے پایاں ہے۔ انسان کا کام صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت تک پہنچانے والے راستے پر چلنا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا ایک مبارک ارشاد ہے:

''كُلُّ الْمَيِّتِ يُخْتَمُ عَلَى عَمَلِهِ اِلَّا الْمُرَابِطَ فَإِنَّهُ يَنْمُو لَهُ عَمَلُهُ اِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ''

''ہر مرنے والے کے اعمال کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے سوائے 'مرابط' یعنی سرحدوں کی حفاظت کرنے والے کے کہ اس کے اعمال قیامت تک بڑھتے رہتے ہیں اور وہ قبر کے فتنے سے بھی محفوظ رہتا ہے۔''(۱)

مرابط سے مراد وہ شخص ہے جس نے اپنے آپ کو اللہ کے راستے کے لئے وقف کر رکھا ہو۔ دعوت الی اللہ کے علاوہ اسے کوئی اور فکر دامن گیر نہ ہو۔ اپنے ملک کی سرحدوں کو خطرات سے محفوظ رکھنا اس کا مقصدِ حیات ہو اور خدا کے دین کو دوسروں تک پہنچانا وہ اپنا سب سے بڑا فریضہ سمجھتا ہو۔ ایسے انسان کی نیکیوں کے رجسٹر کبھی بند نہیں ہوتے بلکہ ہر لحہ نمو پذیر رہتے ہیں۔

دعوت وتبلیغ کی تاریخ میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں، جنہوں نے اپنی زندگی میں ہدایت کے لاکھوں بیج بوئے، لیکن کسی ایک بھی پھول کی خوشبو سونگھے بغیر اس دنیا سے کوچ کر گئے، جبکہ بعض نے پچاس سال بعد اپنا نخلِ تمنا ہرا ہوتے دیکھا۔ ایسے حضرات کی قبریں یقیناً ثواب کی روشنی سے بقعہ نور بن گئی ہوں گی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کے اعمال وثواب کو مسلسل بڑھاتے رہتے ہیں۔ انہیں قبر کے فتنوں سے محفوظ رکھتے ہیں اور ان پر اپنے انوارات کی برسات کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ جسمانی طور پر تو مرجاتے ہیں ملیکن اجر وثواب کے اعتبار سے ان لوگوں سے زیادہ زندہ کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں، جو کہنے کو تو زندہ ہوتے ہیں، لیکن انہیں اُن جیسے اعمال کی توفیق نہیں ہوتی۔

(۱) ابو داؤد: الجهاد، ۱۶؛ الترمذی: فضائل الجهاد، ۲

Marfat.com

۷- دعوت، ایمان اور نفاق

مسلمان اچھی باتوں کا معلم ہوتا ہے۔ وہ اپنے قریب ترین حلقہ احباب سے آغاز کرتے ہوئے اپنے معاشرے میں اچھی باتیں پھیلانے کا حق ادا کرتا ہے۔ یہ اس کے ایمان کا منطقی نتیجہ ہے۔ اس کے ہاتھ اور زبان سے دوسروں کے محفوظ رہنے کا یہی نتیجہ نکل سکتا ہے، نیز جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ تمام مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں۔ اگر اس کے کسی ایک عضو کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس کی وجہ سے سارا جسم بے قرار ہو جاتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ تمام اعضاء کی تندرستی ہی پورے جسم کی تندرستی ہے۔ اس لئے ایک مسلمان کا دوسرے مسلمانوں کے غم میں شریک ہونا، ان کے درد کو اپنا درد اور ان کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھنا بالکل فطرتی سی بات ہے۔ خاص طور پر اگر اس غم اور خوشی کا تعلق آخرت کے ساتھ ہو تو اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے جنت یا دوزخ میں جانے سے کیسے لاتعلق رہ سکتا ہے۔ اسی لئے اپنے مسلمان بھائیوں کی خاطر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقدس فریضے کی ادائیگی ایک مسلمان کا بنیادی وصف ہے۔ قرآن کریم کی درج ذیل آیت کریمہ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

”وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝“ [التوبہ: ۷۱]

”اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اچھے کام کرنے کو کہتے اور بری باتوں سے منع کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے اور خدا اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جن پر خدا رحم کرے گا۔ بے شک خدا غالب حکمت والا ہے۔“

Marfat.com

اس آیت کی روشنی میں مسلمان مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔اس دوستی کا تقاضا معروف یعنی جسے اللہ اچھا سمجھتے ہیں، کا حکم کرنا اور منکر یعنی جسے اللہ برا سمجھتے ہیں، سے روکنا ہے۔درحقیقت ایک انسان سے اپنے دوست کے ساتھ ایسے ہی سلوک کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی کے دوران مسلمان کو اپنی ذات سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔کیونکہ پہلے خود اسلام پر عمل پیرا ہونا، اسلام کو اپنی طبیعت اور فطرتِ ثانیہ بنانا، نماز اور زکوٰۃ کو بہترین طریقے سے ادا کرنا اس کی اولین ذمہ داری ہے۔خلاصہ یہ کہ مسلمان ہر کام میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتا ہے۔اگر معاشرے کے تمام افراد میں ایسے اوصاف پیدا ہو جائیں تو معاشرہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔اللہ کی رحمت اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ ایسے معاشرے کو ڈھانپ کر اس کے افراد کو اپنی حفاظت میں لے لے گی، جس کے نتیجے میں ایک رحمانی ماحول وجود میں آجائے گا۔

اس طرز کے اعلیٰ معاشرے اور مسلمانوں کی منفرد مثال کے مدِ مقابل قرآنِ کریم درج ذیل آیت میں منافقین کی ایک متضاد تصویر پیش کرتا ہے:

"اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَ يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ." [التوبة:٦٧]

"منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کے ہم جنس (یعنی ایک ہی طرح کے) ہیں کہ برے کام کرنے کو کہتے اور نیک کاموں سے منع کرتے اور (خرچ کرنے سے) ہاتھ بند کئے رہتے ہیں انہوں نے خدا کو فراموش کردیا اور اللہ نے بھی جیسے انہیں فراموش کردیا، بے شک منافق نافرمان ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے منافقین کے لئے "ولـــــی" کا لفظ استعمال نہیں کیا، بلکہ اس کے بجائے "بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ" کی تعبیر اختیار کی ہے۔بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ منافقین کے درمیان دوستی کا

Marfat.com

کوئی وجود نہیں ہوتا۔ان کے باہمی تعلقات کی واحد بنیاد مفاد ہوتا ہے۔اگر ان کے مفادات پر تھوڑی سی بھی زد پڑے تو ان کے درمیان شدید تنازعات کھڑے ہو جاتے ہیں۔چنانچہ "بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ" کی تعبیر اختیار کر کے اُن کی نفسیاتی خباثت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

منافقین کی ایک مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ وہ گھٹیا اور بے حیائی کی باتیں معاشرے میں پھیلا کر برائیوں کی ترغیب دیتے، فساد جاری رکھنے کی تلقین کرتے اور اس قسم کے گھٹیا مگر پُرکشش ذرائع سے نوجوان طبقے کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ذرائع ابلاغ کی قوتِ تاثیر کی وجہ سے لوگ اُن کے بہکاوے میں آجاتے ہیں۔عقل کے اندھے اور گمراہ قسم کے لوگ منافقین کے دلالوں، کارندوں اور آلہ کاروں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔اپنے استحصالی غلبے کو برقرار رکھنے کے لئے وہ کسی بھی قسم کے جرم یا گناہ کا ارتکاب کرنے سے نہیں چوکتے۔ان کے اِس برے کردار کی بنیادی وجہ نفاق ہے۔"برے کاموں کی ترغیب دینے اور نیک کاموں سے روکنے" کی خصوصیت کی بدولت دنیا میں ہر جگہ انہیں پہچانا جا سکتا ہے۔

منافقین کی دوسری مشترکہ صفت یہ ہے کہ معاشرے کو اپنے نفسیاتی کنٹرول میں لینے کے لئے نیک کاموں کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتے اور اچھائی سے روکتے ہیں۔وہ عمدہ زندگی گزارنے کے خواہش مند کو پسماندہ اور رجعت پسند ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ان کی نظر میں ہر پابند صوم وصلوۃ پسماندہ اور رجعت پسند ہے۔عورتوں کا باحیا لباس اور دوپٹہ ان کے نزدیک رجعت پسندی اور نحوست کی خوفناک علامت ہے اور امت سے محبت کی بات کرنے والا ان کی نظر میں قوم پرست اور انتہا پسند ہے۔

ہر اچھی اور خوبصورت چیز ان کے نزدیک بری اور قبیح ہے۔وہ مسلمانوں کی ہر خوبی کے بارے میں مریضانہ حد تک منفی سوچ رکھتے ہیں۔اسی نفاق کا نتیجہ ہے کہ قرآن کریم کے مطابق وہ لوگ جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے جن کا ظاہر اور باطن ہم آہنگ نہیں ہوگا۔بلکہ قرآن کریم ان کی واضح صورت گری یوں کرتا ہے:

"بَلْ هُمْ أَضَلُّ" [الاعراف:۱۷۹]

Marfat.com

''بلکہ وہ ان (چارپایوں) سے بھی بھٹکے ہوئے (ہیں)۔''

مسلمانوں کو اپنی ذمہ داریاں کماحقہ ادا کر کے اپنے آپ کو دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں گرنے سے بچانے کی فکر کرنی چاہیے، جس کی صورت یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو نیکیوں کی تلقین و ترغیب دیتے اور برائیوں سے خود بچنے اور دوسروں کو بھی بچانے کی کوشش کرتے رہیں، نیز جس طرح وہ خود نفاق کی کھائی میں گرنے سے بچتے ہیں اسی طرح اپنے دوست احباب کو بھی اس انجامِ بد سے بچانے کی تدبیر کریں۔ انہیں خود بھی چوکنا رہنا چاہئے اور اپنے معاشرے کو بھی بیدار رکھنا چاہیے۔ مذکورہ بالا سطور میں بیان کردہ اوصاف ایک مسلمان کی بنیادی خصوصیات ہیں۔

درحقیقت ایک پرامن اور خوشحال معاشرے کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ کسی چھوٹی سے چھوٹی برائی کو بھی پنپنے کا موقع نہ دیا جائے، کیونکہ جو برائیاں بظاہر دیکھنے میں معمولی سی معلوم ہوتی ہیں وہ وبا کی طرح مختصر سے دورانیے میں اتنی تیزی سے پھیل جاتی ہیں کہ بعض اوقات پورے معاشرے بلکہ پوری قوم اور انسانیت کے وجود کے لئے خطرہ بن جاتی ہیں۔ کسی بھی معاشرے میں فساد اور گمراہی کا آغاز معمولی برائیوں سے ہی ہوتا ہے۔ تاریخ کے صفحات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر معاشروں کی خرابیوں اور انتشار کے پیچھے یہی وجہ کارفرما رہی ہے۔ درج ذیل حدیث اس قسم کے انتشار زدہ معاشروں کے تاریخی تجزیے کے حوالے سے بڑی اہمیت کی حامل ہے:

''بنی اسرائیل میں جو سب سے پہلی خرابی پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ ایک شخص دوسرے شخص سے ملتا اور اس سے کہتا: ''خدا سے ڈر۔ یہ کام نہ کر۔ یہ تیرے لئے حلال نہیں۔'' پھر وہ دوسرے دن اُس سے ملتا تو اِس کے باوجود اس کے ساتھ کھاتا، پیتا اور بیٹھتا۔ جب بنی اسرائیل میں یہ بات عام ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو آپس میں خلط ملط کر دیا۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے درج ذیل آیات تلاوت فرمائیں:

''لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّ کَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ○ کَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ

Marfat.com

عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ○"[المائدة:۷۸-۸۱]

''جولوگ بنی اسرائیل میں کافر ہوئے ان پر داؤداور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی۔ یہ اس لئے کہ نافرمانی کرتے اور حد سے تجاوز کئے جاتے تھے۔(اور) برے کاموں سے جو وہ کرتے تھے ایک دوسرے کو روکتے نہیں تھے۔ بلاشبہ وہ برا کرتے تھے۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''خبردار! تم ضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہنا۔ ظالم کے ہاتھوں کو روکتے رہنا اور اسے حق بات کی پیروی پر مجبور کرتے رہنا۔''(۱)

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بنی اسرائیل کے برائیوں کو روا رکھنے کے رویے کا ذکر کر کے دراصل مسلمانوں کو اس قسم کے انجامِ بد سے بچنے کی ترغیب دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے واقعات سے حاصل ہونے والا سبق ہر دور کے لئے مفید ہے۔

درج ذیل سطور میں ہم قارئین کے سامنے اِس واقعے کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے:

ایک برائی کا ارتکاب ہوتے ہوئے دیکھا گیا۔ جس شخص نے برائی کے مرتکب کو تنبیہ کی درحقیقت اُس نے برائی سے روکا اور اس کی مخالفت کی ،لیکن ایک ایسا کام جو دوام اور ثابت قدمی کا متقاضی تھا اُس کا حق ادا نہیں کیا۔ کیونکہ برائی پر اصرار کرنے والے کے مقابلے میں برائی سے روکنے والا اپنے روحانی اور معنوی ولولے کی حفاظت نہ کر سکا، بلکہ اُس کا قرب حاصل کرنے کے لئے اُس کے ساتھ نشست و برخاست، کھانے پینے اور دوستی کا سلسلہ جاری رکھا، یعنی وہ اس کی غلطی پر اپنی اتنی ناگواری کا اظہار بھی نہ کر سکا، جس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان باقی نہیں رہتا۔ جب معاشرے میں اس برائی کے خلاف مزاحمت باقی نہ رہی تو اسے معاشرے میں پھلنے پھولنے کے لئے سازگار فضا میسر آ گئی، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں میں داخلی اختلافات ڈال کر ان کا شیرازہ بکھیر دیا۔

---

(۱) ابو داؤد: الملاحم، ۱۷؛ ابن ماجہ، الفتن، ۲۰

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے دلوں میں اسی لئے نفاق پیدا کر دیا تھا کہ وہ اندرونِ خانہ برائیوں کا ارتکاب کرنے والوں کے ساتھ تھے۔ اس کی سزا کے طور پر انہیں عیسائیوں کی طرف سے تاریخ کے ایک دور میں شدید قسم کی تکالیف اور ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سے پہلے وہ طویل عرصے تک بابل میں قید رہے۔ اس سے بھی پہلے ایک عرصے تک شاہ پور کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے رہے۔ غرض یہ کہ کسی بھی دور میں انہیں چین و سکون کی زندگی نصیب نہ ہوئی۔ ان کی اس تباہی و بربادی کا واحد سبب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو پس پشت ڈالنا تھا، جس کے نتیجے میں ان کے درمیان طرح طرح کے اختلافات اور فتنوں نے جنم لیا جو بعض اوقات ان کے لئے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوئے۔

حضور ﷺ کا بنی اسرائیل کے مندرجہ بالا احوال کے بیان کرنے سے مقصد اپنی امت کو اپنے فرائض کی ادائیگی کے بارے میں پیشگی خبردار کر کے بنی اسرائیل جیسے انجام سے بچانا ہے، نیز آپ ﷺ اپنی امت کو انتشار اور معاشرتی انحطاط سے بچنے کی تدابیر سے بھی آگاہ فرمانا چاہتے ہیں۔

اس موقع پر میں بعض ایسے امور کی طرف بھی اپنے قارئین کی توجہ مبذول کرانا مناسب خیال کرتا ہوں جو اگرچہ ہمارے موضوع سے براہ راست تعلق نہیں رکھتے، لیکن اُن کا ذکر فائدے سے خالی نہیں۔

بعض اہل علم کی رائے میں بنی اسرائیل کے درمیان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں بھی حقیقی معنی میں اتفاق و اتحاد نہیں پایا جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اُن کی ہمیشہ سرزنش کی جاتی رہی ہے۔ دورِ حاضر میں یہودیوں کا غلبہ دراصل ان کے اپنی تاریخی اقدار و روایات پر سختی سے کاربند رہنے کی وجہ سے پیدا ہونے والے ظاہری اتفاق کا نتیجہ ہے، اسی وجہ سے وہ کسی نہ کسی صورت میں اپنے لئے ایک علیحدہ مملکت کے قیام میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اگر وہ اپنی تاریخی اقدار سے دور ہو کر داخلی اختلافات میں پڑ جاتے تو یقیناً انحطاط کا شکار ہو جاتے۔ آج کے بنی اسرائیل اور یہودی دراصل ایک

Marfat.com

آسمانی دین کے احترام کے فوائد سے ہی بہرہ مند ہو رہے ہیں، اگرچہ اس دین میں بعض پہلوؤں سے تصحیح وتجدید نو کی کافی گنجائش موجود ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی بھی اُن کی طاقت میں اضافے کا موجب ہے۔

آج عالم اسلام مختلف قسم کی بیماریوں، امراض اور فقر وفاقہ کی دلدل میں بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ اسے اپنی خودی کی شناخت اور نئی روح کی ضرورت ہے۔ اس کی روح ذلت، عقل قلت اور تمام اعضاء علت کا شکار ہیں۔ اگر امت کی موجودہ حالت کا فوری مداوا نہ کیا گیا تو یہ مسلسل پستی اور زوال کا شکار ہوتی چلی جائے گی۔ اس کی اصلاح وعلاج کرتے وقت یہ بات ذہن میں ملحوظ رہنی چاہئے کہ اس امت کا دائرہ کار ساری کائنات پر محیط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر مذکورہ بالا امور کی رعایت رکھی گئی تو اسلام ان شاء اللہ محبت، آشتی اور اتحاد کو پھیلا کر اور پورے عالم میں ایک نئی روح پھونک کر دنیا کی تمام اقوام کا نگہبان ثابت ہوگا۔

بہت سے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ دعوت وارشاد کے فریضے کی ادائیگی ایمان کے شعائر میں سے ہے۔ میں اس مضمون کا اختتام اسی قسم کے ایک واقعہ پر کرنا چاہوں گا، جس کا تعلق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت سے ہے:

ایک دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد ارشاد فرمایا: اے لوگو! تم یہ آیت:

"یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَایَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ اِلَی اللّٰهِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعاً فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ"

"اے ایمان والو! اپنی جانوں کی حفاظت کرو۔ جب تم ہدایت پر ہو تو کوئی گمراہ تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا۔ تم سب کو خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اس وقت وہ تم کو تمہارے سب کاموں سے جو (دنیا میں) کیئے تھے آگاہ کرے گا (اور ان کا بدلہ دے گا)" (سورۃ مائدہ: ۱۰۵) پڑھتے ہو اور اس سے غلط مفہوم

Marfat.com

مراد لیتے ہو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے:

"وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ أَوْ لَيُوشِكَنَّ اللّٰهُ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِنْهُ ثُمَّ تَدْعُونَهُ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ"

''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب نازل فرمادیں گے پھر تم اس سے دعائیں مانگو گے لیکن وہ قبول نہ ہوں گی۔''(۱)

اس آیت کریمہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم دوسروں کی فکر سے غافل ہو کر صرف اپنی ذات کے گنبد میں محصور ہو جاؤ، بلکہ اس آیت سے اس کا برعکس مفہوم مراد ہے۔ وہ یہ کہ تم دوسروں کی لغزشوں اور گمراہ کن باتوں کی جستجو میں پڑ کر اپنی ذات سے غافل مت ہو جانا۔ دوسرے لفظوں میں اس آیت کریمہ میں محاسبہ نفس کی ترغیب ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ مفہوم سب سے بہتر طور پر سب سے پہلے سمجھا اور آیت کریمہ کے اس درست فہم کی تائید میں نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث بھی بیان کی۔ اس موضوع پر اور بھی بہت سی احادیث موجود ہیں جن میں سے بعض درج ذیل سطور میں ذکر کرنا میں مناسب محسوس کرتا ہوں:

امام ترمذی رحمہ اللہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس ذات کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم ضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو، ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب نازل فرمادیں گے پھر تم دعائیں مانگو گے لیکن وہ قبول نہ ہوں گی۔''(۲)

امام ترمذی رحمہ اللہ نے ایک ضعیف حدیث بھی بیان فرمائی ہے، جس میں درج ذیل اضافہ موجود ہے: ''تم پر تم میں سے برے لوگ مسلط کر دے گا پھر تم میں سے بہترین لوگ دعائیں مانگیں گے لیکن وہ قبول نہ ہوں گی۔''(۳)

(۱) الترمذی: الفتن، ۹؛ المسند: ۵/۳۸۸

(۲) الترمذی: الفتن، ۹؛ المسند: ۵/۳۸۸ (گزشتہ صفحہ کا حاشیہ)

(۳) الهيثمي: مجمع الزوائد، ۷/۲٦٦

Marfat.com

"شرار" (برے لوگوں) سے مراد ایسے گھٹیا اور اجڈ قسم کے لوگ مراد ہیں، جنہیں کاموں اور انتظامی امور کی کچھ بھی سمجھ بوجھ نہیں ہوتی۔ وہ نہ تو دین اور دین داری کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں اور نہ ہی اللہ کی کتاب اور رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ دین کے شعائر کا کما حقہ احترام نہیں کرتے، بلکہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ خدا جس قوم یا مملکت کی قیادت ایسے لوگوں کے سپرد کرتے ہیں وہ ناکام و نامراد ہو جاتی ہے، چنانچہ عذاب کی ایک صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی باگ ڈور برے لوگوں کے سپرد کر کے انہیں اس قوم کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیتے ہیں۔ دورِ حاضر میں یہ بالکل منصفانہ سزا ہے، جس کے مسلمان بجا طور پر مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ڈھیل تو دیتے ہیں، لیکن غافل کبھی نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی عدم ادائیگی کی سزا مؤخر کرتے رہتے ہیں، لیکن جوں ہی سزا کا وقت آتا ہے، انہیں اپنی زبردست گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر اچھے اور نیکوکار لوگوں سے مسجدیں بھر جائیں اور وہ ساری ساری رات خدا کے حضور گڑگڑا کر اتنے آنسو بہائیں کہ ان کی جائے نمازیں تر ہو جائیں تب بھی وہ عذاب ان سے نہیں ہٹایا جاتا اور نہ ہی وہ اس کی مدت کی تکمیل سے پہلے اس کی پکڑ سے بچ سکتے ہیں۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے۔ اگر اس قانون کا اطلاق ایک حقیقت کے طور پر عملی زندگی کی تمام اکائیوں پر کیا جائے تو یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ ازل سے اس قانون میں کبھی اختلاف رونما نہیں ہوا۔ ہماری موجودہ حالت بار بار دہرائے جانے والے اسی تاریخی تسلسل کا ایک حصہ ہے۔ اگر مساجد میں کی جانے والی دعاؤں، آہ و زاری، چیخ و پکار اور مناجات میں سیلاب کی طرح بہنے والے آنسوؤں کو بارگاہ ایزدی میں قبولیت حاصل نہیں ہوتی تو اس کی سوائے اس کے اور کیا توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ یہ ہمارے کسی ایسے گناہ کا کفارہ نہیں بن سکتیں، جس پر ہم نے بہت اصرار کیا ہوا ہے؟ وہ گناہ ایک مقدس فریضے کو پس پشت ڈالنا یا کم از کم اسے کما حقہ ادا نہ کرنا ہے۔

اس گناہ کی پاداش میں ہمارا اپنے پروردگار سے رابطہ ٹوٹ چکا ہے۔ ہماری پیدائش کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ خاص طور پر اللہ کے دین کے داعی تو اپنے آپ کو راہِ خدا

Marfat.com

کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ وہ خدا کے عشق میں اپنی جدوجہد کا مقصد جنت کو بھی نہیں بناتے، بلکہ اگر انہیں جنت میں بھی دعوت وتبلیغ کا موقع ملے تو اسے جنت کی دیگر نعمتوں پر ترجیح دیں۔ وہ ایسے باہمت لوگ ہوتے ہیں کہ اگر انہیں جہنم کے داروغوں کو بھی دعوت دینے کا موقع ملے تو اس مقصد کے لئے بلا تردد جہنم میں داخل کود پڑیں۔ اگر ایسے لوگ بھی اپنے عظیم المرتبت مقصد تخلیق کو پس پشت ڈال دیں تو دنیا پر مصائب و آلام کا نزول ہوا ہی چاہتا ہے۔ ایسی صورتِ حال کے پیش آجانے کے بعد دعا کے علاوہ کوئی چارہء کار باقی نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ دعا کے فوائد سے خوب واقف ہیں۔ ایسی صورت حال کا پیش آنا ایک خاص نقطہ نظر سے مکمل تباہی کے راستے پر چلنے کے مترادف ہے۔ وہ وقت بڑا کٹھن ہوتا ہے، جب رحمتِ خداوندی پس پردہ چلی جاتی ہے اور قہر خداوندی کا نہ رکنے والے سیلابی ریلے کی مانند ظہور ہوتا ہے۔

اگر آپ عالم اسلام کی زبوں حالی کا جائزہ لیں تو آپ کو اس آئینے میں مذکورہ بالا حقائق یکے بعد دیگرے نظر آجائیں گے۔

اگر آپ تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کیسے ایک عظیم قوم ذلت کی کھائی میں جا گری۔ آپ اس ہولناک منظر کا سامنا نہ کر پائیں گے۔ بعد میں آنے والی نسلیں خدا، اس کے رسول ﷺ اور اس کی کتاب سے اپنا رشتہ توڑ کر گمراہی کے گہرے کنویں میں جا گریں۔ وہ روح اور دل سے محروم ہو کر ایسی عجیب و غریب مخلوق بن گئیں جو عقل و خرد سے محروم اور اپنے پیٹ و معدہ کی غلام تھیں۔

یہ بدقسمت قومیں غیر ملکی نادیدہ قوتوں کے شکنجوں میں بری طرح جکڑی ہوئی ہیں، جن سے خلاصی کی انہیں کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کعبہ شریف میں کی جانے والی دعاؤں سے کون سا مسئلہ حل ہو گیا؟ اور مساجد میں بہنے والے آنسوؤں نے ہماری کوئی مدد کیوں نہ کی؟... اس کی وجہ یہ ہے کہ اس گناہ کا کفارہ یہ امور نہیں ہیں۔ ہم پر یہ مصیبت ایک عظیم اور جلیل القدر ذمہ داری سے غفلت برتنے کے نتیجے میں نازل ہوئی ہے۔ ہمیں اپنے مسائل کا درست حل تلاش کرنا ہوگا۔ اس گہری کھائی سے نکلنے کا بھی وہی راستہ ہے جہاں سے ہم اس میں گرے تھے۔ اگر ہم اس فریضے کو کما حقہ ادا کرنے لگ

Marfat.com

جائیں تو اللہ کے حکم سے اس خوفناک صورت حال سے ہمیں نجات نصیب ہو جائے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان سے دعا کرنے کے اخروی فوائد ہیں، لیکن صرف یہی کافی نہیں، بلکہ دنیا میں ذلت ورسوائی سے نجات کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی کما حقہ ادائیگی ناگزیر ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ ممکن ہے کہ اگر کسی معاشرے میں بہت سے اصحابِ فضیلت لوگ موجود ہوں، جنہیں خدا کا قرب بھی نصیب ہو، لیکن اگر وہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا نہ کیا جا رہا ہو اور نہ ہی اسے منظم انداز میں ادا کرنے کے لئے کسی ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا ہو تو اللہ تعالیٰ ایسے معاشرے کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ ایسے معاشرے یا قوم کو کبھی بھی دوام نصیب نہیں ہو سکتا۔

یہ بات ٹھیک ہے کہ اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کے گناہوں کی پاداش میں تمام لوگوں کو نہیں پکڑتے۔ نیز گمراہ اور عیش پرست لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے پورے معاشرے کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتے، لیکن اگر لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قدرت کے باوجود اس فریضے کو ادا نہ کریں تو پورے معاشرے پر عذاب نازل ہو جاتا ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس بارے میں ایک حدیث شریف روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوُا الْمُنْكَرَ فَلَمْ يُنْكِرُوهُ أَوْشَكَ أَنْ يَعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابِهِ"

"اگر لوگ برائی کو ہوتے دیکھیں لیکن اس سے منع نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ سب لوگوں پر اپنا عذاب نازل فرما دیں۔"(1)

یہی بات درج ذیل آیت کریمہ میں بھی بیان کی گئی ہے:

"وَ اتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ." [الأنفال:۲۵]

(۱) المسند: ۱/ ۲۵؛ ابو داؤد: الملاحم، ۱۷

Marfat.com

''اور اس فتنے سے ڈرو جو خصوصیت کے ساتھ انہی لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں گنہگار ہیں اور جان رکھو کہ خدا سخت عذاب دینے والا ہے۔''

۸۔ تاریخی واقعات کی روشنی میں دعوت و تبلیغ اور ہلاکت و بربادی

تاریخ میں اقوامِ عالم کی تباہی و بربادی کے اسباب پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی کے پہلو سے بھی روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے واقعات کا جائزہ لینے سے درج ذیل امور سامنے آتے ہیں:

اسلامی معاشرے کی بقا دو بنیادی ستونوں پر قائم ہے، جن کی عدم موجودگی سے معاشرے کی تباہی و بربادی یقینی ہو جاتی ہے۔ اس معاملے کے ایجابی اور منفی دونوں پہلوؤں کا ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ ایجابی پہلو تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسی قوم کو ہلاک نہیں فرماتے، جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے رہی ہو یا اس کے کچھ افراد اس فریضے کی ادائیگی میں لگے ہوئے ہوں اگرچہ وہ تھوڑے سے ہی کیوں نہ ہوں بشرطیکہ وہ مغلوب نہ ہوں۔ جبکہ سلبی پہلو یہ ہے کہ اگر کسی قوم میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے سے بالکل غفلت برتی جانے لگے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسے تباہ و برباد فرما دیتے ہیں۔ نیز اگر اس قوم کے بہت سے افراد اس مقدس فریضے کو سرانجام تو دے رہے ہوں، لیکن ان پر دوسروں کی گمراہی اور فسق و فجور غالب آ جائے اور وہ اپنی مغلوبیت کا اقرار بھی کر لیں تو اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو بھی تباہ کر دیتے ہیں۔ اپنے مقام پر ہم اس بات کی مزید وضاحت آیاتِ کریمہ کی روشنی میں کریں گے۔ ہم یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کسی مسلمان قوم کو ہلاکت و بربادی سے صرف اس جلیل القدر فریضے کے قیام کے ذریعے ہی بچایا جا سکتا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ دعوت و ارشاد کے لئے باقاعدہ ادارے قائم کئے جائیں۔ اس قسم کی سنجیدہ کوششوں کے بغیر امت کو اس کے منطقی انجام سے نہیں بچایا جا سکتا۔

۱۔ حضرت نوح علیہ السلام

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی پوری زندگی اپنی قوم کو حق بات کی طرف دعوت دیتے

Marfat.com

ہوئے گزار دی، لیکن انہیں ہر بار نہ صرف انکار کا سامنا کرنا پڑا، بلکہ تکالیف بھی اٹھانی پڑیں۔آپ پر صرف چند ایک لوگ ایمان لائے۔آخر کار حضرت نوح علیہ السلام کافروں کے مقابلے میں اپنی مغلوبیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے۔آپؑ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے مدد کی درخواست کی۔آپ جیسے نبی کی دعا کہاں رد ہوتی؟ چنانچہ آپؑ کی دعا بھی قبول ہوئی۔قرآن کریم نے اس واقعے کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

"كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَّازْدُجِرَ ۝ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ۝ تَجْرِیْ بِاَعْيُنِنَا جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝ وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِیْ وَنُذُرِ ۝" [القمر:۹-۱۶]

"ان سے پہلے نوح کی قوم نے بھی تکذیب کی تھی۔تو انہوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا اور کہا کہ دیوانہ ہے اور انہیں ڈانٹا بھی۔تو انہوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی (بارالٰہی) میں (ان کے مقابلے میں) کمزور ہوں تو (ان سے) بدلہ لے۔پس ہم نے زور کے مینہ سے آسمان کے دہانے کھول دیے اور زمین میں چشمے جاری کر دیئے تو پانی ایک کام کے لئے (جو مقدر ہو چکا تھا) جمع ہو گیا اور ہم نے نوح کو ایک کشتی پر جو تختوں اور میخوں سے تیار کی گئی تھی سوار کر لیا۔ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی تھی (یہ سب کچھ) اس شخص کے انتقام کے لئے کیا گیا جس کو کافر مانتے نہ تھے اور ہم نے اس کو ایک عبرت بنا چھوڑا تو کوئی ہے کہ سوچے سمجھے؟ سو (دیکھ لو کہ) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا؟"

Marfat.com

حضرت نوح علیہ السلام نبوت کے تاج سے سرفراز کئے گئے تھے۔آپ اللہ کی طرف سے مامور تھے۔صرف اسی کے اوامر کی پیروی کرتے اور اسی کی عبادت کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔لیکن آپؑ کی قوم آپ کو مجنون کہتی۔ان کی یہ بہتان طرازی ہی آپؑ کے کامل الایمان ہونے کی دلیل تھی۔اس قوم کے ہاں معاشرتی زندگی کے الٹے معیار تھے۔ان کے ہاں اقدار و روایات کی صورت حال بھی بالکل برعکس تھی۔چونکہ نبی ان کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا تھا اس لئے وہ اسے مجنون کہا کرتے اور عملی طور پر اس کا پروپیگنڈا بھی کرتے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نبی پورے معاشرے کی تعمیر نو اور اس کی بری باتوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ظاہر ہے اس قسم کے معاشرے میں اس طرح کے انسان کو مجنون ہی کہا جاتا تھا۔جیسا کہ رسول اللہ ﷺ سے مروی حدیث میں ہے: ”خدا کا ذکر اتنی کثرت سے کیا کرو کہ لوگ تمہیں مجنون کہنے لگیں۔“(1) ایسی صورت حال میں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے ہاتھ دعا کے لئے بلند کئے اور فرمایا: ﴿إِنِّي مَغْلُوبٌ فَانتَصِرْ﴾ ”(بارالٰہی) میں (ان کے مقابلے میں) کمزور ہوں تو (ان سے) بدلہ لے۔“ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی گمراہ قوم کو غرق کر دیا اور آسمان اور زمین کے چشموں کے منہ زور پانی کے ذریعے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔والے نبی کی موجودگی کے باوجود اگر وہ نبی اپنی مغلوبیت کا اقرار کر لے تو ایسی تہذیب کو غرق کر دیا جاتا ہے۔

وہ بحر اطلس کی تہذیب تھی یا کوئی اور۔نتیجہ یہ ہے کہ کافروں کو بحر اطلس یا کسی اور سمندر میں غرق کر دیا گیا۔اس واقعے سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہر وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بجالانے والے نبی کی موجودگی کے باوجود اگر وہ نبی اپنی مغلوبیت کا اقرار کر لے تو ایسی تہذیب کو غرق کر دیا جاتا ہے۔

آیت کریمہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے غرق ہونے اور مومنین کے حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ نجات پا جانے کے ذکر کے بعد یہ بات کہی گئی: [فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ] ”تو کوئی ہے کہ سوچے سمجھے۔“یعنی کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟ ہم بھی پوچھتے ہیں: ”زمین پر پھیلے

---

(1) المسند:3/68؛الترمذی:الزھد،39،ابن حبان،3/99

Marfat.com

ہوئے کھنڈرات وآثار سے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟" ان میں سے سینکڑوں آثار نافرمان قوموں کی تباہی وبربادی کی علامت بنے ہوئے ہیں۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک ہمارے سامنے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کھلی نشانی ہے۔ "لیکن کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟"

ب۔ حضرت صالح علیہ السلام

حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے بھی اپنے نبی کی نافرمانی کی۔ جب اللہ تعالیٰ نے معجزے کے طور پر انہیں ایک اونٹنی دی اور انہیں اسے کوئی گزند نہ پہنچانے کا حکم دیا تو انہوں نے سرکشی اختیار کرتے ہوئے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ شاید بعض لوگوں کو اونٹنی کے درپے نہ ہونے کے خداوندی حکم پر تعجب ہو، لیکن اگر یہ بات پیش نظر رکھی جائے کہ اللہ تعالیٰ ہر دور کے لئے خاص قسم کے احکامات دیتے ہیں تو یہ تعجب زائل ہو جائے گا۔ جس طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں نماز پڑھنے، زکوٰۃ ادا کرنے اور ماہ رمضان کے روزے رکھنے کا حکم دیا، نیز شراب نوشی، سودی لین دین اور زنا کاری سے منع فرمایا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کو اونٹنی کے درپے نہ ہونے کا حکم دیا، لیکن وہ اس امتحان میں ناکام ثابت ہوئے۔ اس واقعہ پر سورۃ الشمس کی درج ذیل آیات روشنی ڈالتی ہیں:

> كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَآ o اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰهَا o فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا o فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰهَا. [الشمس:۱۱۔۱۴]
>
> "(قوم) ثمود نے اپنی سرکشی کے سبب (پیغمبر کو) جھٹلایا۔ جب ان میں سے ایک نہایت بدبخت اٹھا تو خدا کے پیغمبر (صالحؑ) نے ان سے کہا کہ خدا کی اونٹنی اور اس کے پانی پینے کی باری سے حذر کرو۔ مگر انہوں نے پیغمبر کو جھٹلایا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ تو خدا نے ان کے گناہ کے سبب ان پر عذاب نازل کیا اور سب کو (ہلاک کر کے) برابر کر دیا۔"

Marfat.com

جب قومِ ثمود نے اپنے نبی حضرت صالح علیہ السلام کی نافرمانی کی تو انہوں نے صرف اتنا کہا: (نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيَاهَا) ''خدا کی اونٹنی اور اس کے پانی پینے کی باری سے حذر کرو۔'' کیونکہ اونٹنی کو گزند پہنچانا عذاب و مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف تھا، لیکن ان میں سے بدبخت ترین شخص نے اس کی کونچیں کاٹ کر عذابِ الٰہی کو دعوت دے ڈالی۔ یہ بات ہر دور اور زمانے میں پیش آتی رہی ہے کہ کسی قوم میں سے بعض لوگ کفر اختیار کرنے میں پیش قدمی کرتے ہیں اور باقی لوگ جوق در جوق ان کی پیروی۔ جن لوگوں نے مختلف ادوار میں ہمارے دین کو چھیڑا در حقیقت انہوں نے عذاب الٰہی کو دعوت دے کر ایک عظیم قوم کو بلندیوں سے پستیوں میں گرا دیا۔ اس امت کے زوال کا آغاز قرآنِ کریم کو چھیڑنے سے ہو گیا تھا۔ پھر یہ سلسلہ مختلف ادوار میں مختلف اشخاص کے ہاتھوں جاری رہا۔ کیا ایک دور میں کعبہ شریف اور چاہِ زمزم کی بے حرمتی نہیں کی گئی؟ اسی طرح کے بعض اور واقعات بھی تاریخ میں پیش آتے رہے ہیں۔

چنانچہ قومِ ثمود کا بدبخت ترین شخص آگے بڑھا اور اللہ کے نبی علیہ السلام کے سمجھانے کے باوجود کہ '' ایسا نہ کرو اسے گزند نہ پہنچاؤ'' اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ جن لوگوں نے حقیقتاً یہ کام سرانجام دیا اور جو لوگ اس پر خاموش رہے انہوں نے اپنی منزل خود ہی کھوٹی کر ڈالی۔ چنانچہ ان پر قہرِ الٰہی نازل ہوا جس نے انہیں بغیر کسی تفریق کے تباہ و برباد کر کے قصہ کو پارینہ بنا دیا۔ خدا نے ان کا ایسا نشان مٹایا کہ ان کا ذکر صرف برے الفاظ کے ساتھ ہی کیا جاتا ہے۔

عذاب بعض اوقات جسمانی ہوتا ہے، جس میں صورتیں مسخ کر دی جاتی ہیں، لیکن بعض اوقات عذاب کا تعلق صورت کی بجائے سیرت کے ساتھ ہوتا ہے۔ سیرت کے عذاب کی سنگینی کے باوجود اس کا سمجھنا صرف صورت کے عذاب کی بہ نسبت زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ دورِ حاضر میں نازل ہونے والے عذاب کی اکثر صورتوں کا تعلق اسی دوسری قسم کے ساتھ ہے۔ میرے نزدیک لوگوں کے حیرت انگیز حد تک غفلت میں ڈوبے رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہیں اپنے اوپر نازل ہونے والے عذاب کا ادراک نہیں۔ سورۃ الشمس کا اختتام [وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا] ''اور اس کو ان کے بدلہ لینے کا کچھ بھی ڈر نہیں۔'' پر ہوتا ہے، یعنی وہ ہر چیز کا مالک ہے اور اپنی ملکیت میں اپنی خواہش کے

Marfat.com

مطابق تصرفات کرتا ہے۔

مذکورہ بالا قرآنی آیات میں ہم نے دیکھا کہ جب قوم ثمود کے نبی حضرت صالح علیہ السلام بالکل مغلوب ہو گئے اور ان کی دعوت وتبلیغ کی آواز کو کسی نے نہ سنا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس قوم کو تباہ و برباد کر کے ملیامیٹ کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کائنات خاص طور پر انسان کو اپنی معرفت اور اپنے اوپر ایمان لانے کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ یہی دنیا کے وجود کا مقصد ہے۔ اہل ایمان کے مغلوب ہونے کی صورت میں جب یہ مقصد فوت ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس دور کے لوگوں کو تباہ و برباد کر کے ملیامیٹ کر دیتے ہیں۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے، جس میں کبھی بھی تغیر وتبدل ممکن نہیں۔

ج۔ حضرت لوط علیہ السلام

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معاصر تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم میں لواطت (اغلام بازی) کا گناہ عام ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کسی قوم نے اس جرم کا ارتکاب نہ کیا تھا۔ آپ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس قبیح حرکت سے منع کیا، لیکن جب نوخیز لڑکوں کی صورت میں کچھ مہمان آپ علیہ السلام کے گھر ٹھہرے تو گمراہ قوم اپنے نبی کے گھر کی طرف دوڑ پڑی اور ان سے اپنی خواہش کا مطالبہ کرنے لگی۔ حضرت لوط علیہ السلام نے ﴿وَلَا تُخْزُونِی فِی ضَیْفِی﴾ ''اور میرے مہمانوں (کے بارے) میں میری آبرو نہ کھوؤ'' کہہ کر ان سے درخواست کی اور ایک جائز حل کے طور پر اپنی بیٹیوں کے ساتھ ان کے نکاح کی تجویز پیش کی۔ لیکن آپ علیہ السلام کی ساری جدوجہد اس وقت بے کار ثابت ہوئی جب آپ کی قوم نے کہا: ﴿لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِی بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ﴾ ''تم کو معلوم ہے کہ تمہاری (قوم کی) بیٹیوں کی ہمیں کچھ حاجت نہیں اور جو ہماری غرض ہے اسے تم (خوب) جانتے ہو۔'' اس موقع پر حضرت لوط علیہ السلام نے حسرت بھرے لہجے میں کہا: ﴿لَوْ أَنَّ لِی بِكُمْ قُوَّةً أَوْ آوِی إِلَى رُكْنٍ شَدِيدٍ﴾ ''اے کاش مجھ میں تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا کسی مضبوط قلعے میں پناہ پکڑ سکتا۔'' درحقیقت آپ علیہ السلام

Marfat.com

کو مضبوط قلعے کی پناہ حاصل تھی، لیکن واقعے کی سنگینی کے باعث آپ کی زبان پر یہ الفاظ آ گئے۔ اس موقع پر مہمانوں نے اس بات کا انکشاف کر دیا کہ وہ فرشتے ہیں اور یہ گمراہ قوم ان کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی۔

ذیل میں ہم قرآن کریم میں تفصیل سے ذکر کردہ اس واقعے کے بعض حصے پیش کرتے ہیں:

وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَ ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّ قَالَ هٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ ٥ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ وَ مِنْ قَبْلُ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ قَالَ یٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ ٥ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ وَ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ ٥ قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ ٥ قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ یَّصِلُوْٓا اِلَیْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ وَ لَا یَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ اِنَّهٗ مُصِیْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ ٥ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ مَّنْضُوْدٍ ٥ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَ مَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ ٥

[ھود: ۷۷-۸۳]

"اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس آئے تو وہ ان (کے آنے) سے غمناک اور تنگ دل ہوئے اور کہنے لگے کہ آج کا دن بڑی مشکل کا دن ہے اور لوط کی قوم کے لوگ ان کے پاس بے تحاشا دوڑتے ہوئے آئے اور یہ لوگ پہلے ہی سے فعل شنیع کیا کرتے تھے (لوط نے) کہا کہ اے قوم یہ (جو) میری (قوم کی) لڑکیاں ہیں یہ تمہارے لئے (جائز اور) پاک ہیں تو خدا سے ڈرو اور میرے مہمانوں (کے بارے) میں میری آبرو نہ کھوؤ۔ کیا تم میں کوئی

Marfat.com

بھی شائستہ آدمی نہیں؟ وہ بولے تم کو معلوم ہے کہ تمہاری (قوم کی) بیٹیوں کی ہمیں کچھ حاجت نہیں اور جو ہماری غرض ہے اسے تم (خوب) جانتے ہو۔ (لوط نے) کہا اے کاش مجھ میں تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا کسی مضبوط قلعے میں پناہ پکڑ سکتا۔ فرشتوں نے کہا کہ لوط! ہم تمہارے پروردگار کے فرشتے ہیں۔ یہ لوگ ہرگز تم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ تو کچھ رات رہے سے اپنے گھر والوں کو لے کر چل دو اور تم میں سے کوئی شخص پیچھے پھر کر نہ دیکھے مگر تمہاری بیوی کہ جو آفت ان پر پڑنے والی ہے وہی اس پر پڑے گی۔ ان کے (عذاب کے) وعدے کا وقت صبح ہے اور کیا صبح کچھ دور ہے؟ تو جب ہمارا حکم آیا ہم نے اس (بستی) کو (الٹ کر) نیچے اوپر کر دیا۔ اور ان پر پتھر کی تہہ بہ تہہ (یعنی پے در پے) کنکریاں برسائیں جن پر تمہارے پروردگار کے ہاں سے نشان کئے ہوئے تھے اور وہ (بستی ان) ظالموں سے کچھ دور نہیں۔"

اس طرح سدوم (قوم لوط علیہ السلام کی بستی) کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے تہ و بالا کر کے بحیرہ مردار (Dead Sea) کی گہرائیوں میں دفن کر دیا۔ یقیناً یہ عذاب صرف قوم لوط کے ساتھ ہی مختص نہیں تھا، بلکہ ہر دور کے ظالم لوگ اس قسم کے عذاب کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔

اس کی سب سے واضح دلیل اٹلی کا شہر پومپی آئی (Pompeii) ہے۔ وہاں کے عیسائی لوگوں کو حق بات کی طرف بلاتے تھے، لیکن وہ مغلوب تھے کوئی ان کی بات نہ سنتا۔ ایک دن جب پوری قوم گناہوں اور لہو و لعب میں منہمک تھی اللہ سبحانہ تعالیٰ نے وسویس (Vesuvius) نامی آتش فشاں پہاڑ سے نکلنے والے لاوے کے ذریعے اسی جگہ کو ان کے لئے قبرستان بنا دیا، جبکہ روحانی اعتبار سے موت کا شکار تو وہ مدتوں پہلے ہو چکے تھے۔ جو لوگ جان بچانے کے لئے ساحل سمندر کی طرف دوڑے راکھ کے عظیم طوفان نے ان کا تعاقب کیا اور جہاں تھے وہیں انہیں دفن کر دیا۔

Marfat.com

د۔ بعض دیگر اقوام

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدرتِ ازلیہ نے قومِ لوط علیہ السلام کے کافروں کو اپنی زبردست گرفت میں لیا اس نے دیگر اقوام کو بھی اسی قانون کے مطابق تباہ و برباد کیا۔

مثلاً جب اندلس کی آٹھ سو سالہ عظیم الشان تہذیب میں داخلی طور پر تبدیلیاں پیدا ہوئیں تو وہاں کے معزز لوگوں کو فرڈیننڈ (Ferdinand) کی تلوار نے ذلت کا مزا چکھا دیا۔ مسلمان اس افسوس ناک حالت پر غم سے روتے تھے، لیکن اس وقت ندامت کا کیا فائدہ؟ کیونکہ وہ اپنے وجود کی عمارت کو خود اپنے ہاتھوں سے گرانے پر (جس پر رونا چاہئے تھا) نہیں روتے تھے، بلکہ وہ تو طلیطلہ کے باغات، چشموں اور حماموں کے غم میں اور اپنے جنازوں پر روتے تھے۔ یہی روحانی پستی اور ذلت عباسیوں کی تباہی کا باعث بنی اور اسی گندگی کے باعث امویوں کو زوال ہوا۔ سلجوقیوں کو بری طرزِ زندگی نے ہی زہر کا پیالہ پلا دیا۔ عثمانیوں کا انجام بھی روحانی پستی اور انحطاط کا نتیجہ تھا۔ اگر آپ کو ''دولمہ باغچہ'' کے محل میں جانے کا اتفاق ہو تو آپ اپنے آپ کو اس کی در و دیوار پر انحطاط کی نشانیوں کے طور پر لگی ہوئی تختیوں کے سامنے کھڑا پائیں گے۔ آپ کو یہ سن کر سخت حیرت و استعجاب ہوگا کہ ان در و دیوار کو سونے کے پانی کے ذریعے مزین کرنے کے لئے سولہ ٹن سونا استعمال کیا گیا تھا۔

یہ خدا کا ایسا اٹل قانون ہے کہ جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اسی قانون کی روشنی میں آپ تاریخ کی تمام اقوام مثلاً رومی، ساسانی اور مصری تہذیبوں کے عروج و زوال کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسی بستی کو ہلاک فرما دیتے ہیں، جس میں اللہ کا ذکر کرنے والے اور اس پر ایمان رکھنے والے لوگ موجود نہ ہوں، کیونکہ ایسی صورت حال میں ایسے شہر کو باقی رکھنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ شاید قیامت کے برپا ہونے کی بھی یہی وجہ ہو کہ مسلمانوں کی خستہ حالی اور کفر و الحاد کے غلبے کی وجہ سے دنیا کے وجود کی حکمت باقی نہ رہے گی، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نظامِ عالم کی بساط لپیٹ دیں گے۔

آج قرآن فہمی کے فقدان اور مقاصدِ قرآن کے عدم ادراک کی بدولت فتنوں اور مصائب

Marfat.com

کے مہیب سائے ہم پر چھائے ہوئے ہیں۔اگر ہماری تباہی وبربادی کو کسی چیز نے روکا ہوا ہے تو وہ حق تعالیٰ شانہ کی بے پناہ رحمت وبردباری ہے۔جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اکثر کہا کرتے تھے: ''اے اللہ آپ کتنے بردبار ہیں؟'' یقیناً اللہ تعالیٰ بردبار ہیں اور گناہ گاروں کو مہلت دیتے رہتے ہیں، لیکن اُن سے غافل ہرگز نہیں۔حدیث شریف میں آتا ہے: ''اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتے رہتے ہیں، لیکن جب اس کی گرفت فرماتے ہیں تو وہ اس سے بچ نہیں سکتا۔''(۱)

ذرا اس بات پر بھی غور کیجیے کہ کیسے اللہ تعالیٰ اپنی صفات الرحمٰن اور الرحیم کے ذریعے ہمیں اپنا تعارف کراتا ہے...ہمارا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ ہم اس پر ایمان لائیں اور اس کی ان عظیم صفات کا حق بندگی اور اخلاص کے ذریعے ادا کریں، اس کی طرف لوگوں کو دعوت دیں اور ان کے دلوں کو ایمان وسکون کے نور سے منور کر کے اس کی طرف متوجہ کریں۔

''درحقیقت مؤمن امن پسند انسان ہوتا ہے۔اس سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔مسلمان انسانیت اور اجتماعی زندگی کے ضامن ومحافظ ہیں۔مؤمن کو ساری انسانیت کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خاص طور پر امن کا علمبردار ہونا چاہیے۔وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی عمدہ تعلیمات دوسروں تک پہنچانے، معاشرے کی تعمیر اور اسے ہر قسم کے نقصان سے بچانے کی فکر میں لگا رہتا ہے، جو لوگ اس عظیم فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی برتتے ہیں، درحقیقت وہ ''مومنانہ'' اوصاف سے محروم ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔''

مومن کی بہت سی ذمہ داریاں ہیں، جن کا دائرہ کار مختلف ہے۔اس دائرہ کار کی ابتداء دل سے ہوتی ہے اور پھر یہ حسب استطاعت گھر، بستی، شہر، امت اور انسانیت تک وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔مؤمن کی ذمہ داریوں کے مذکورہ بالا تمام دائرہائے کار باہم مربوط ہوتے ہیں۔اگر مؤمن کو دنیا کی آخری حدود تک نور ہدایت پہنچانے کا موقع ملے تو وہ اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے۔اگر اس کے

(۱) البخاری: التفسیر، (۱۱)، ۵؛ مسلم: البر، ۶۱

Marfat.com

مخاطبین اس کی گفتگو نہ سمجھ سکیں اور اس کے پیغام کی حقیقت کا ادراک نہ کر سکیں، تب بھی یہ فائدے سے خالی نہیں، کیونکہ ان کی راہنمائی سے غفلت کے نتیجے میں ان میں پیدا ہونے والا احساسِ محرومی بہت بڑا نقصان ہے، جس کا انجام اچھا نہیں۔

نیز اگر کفر و الحاد کے سیلاب کے سامنے بند نہ باندھے گئے تو کفار و ملحدین کے ساتھ ساتھ مؤمنین بھی تباہی و بربادی کا شکار ہو جائیں گے اس لئے کم از کم عمومی بربادی کا شکار ہونے سے بچنے کے لئے مسلمانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہنا چاہیے۔

اس بات پر مزید روشنی حضور ﷺ کی درج ذیل حدیث شریف سے پڑتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کی حدود کو قائم رکھنے والوں اور ان میں واقع ہو جانے والوں کی مثال ان لوگوں کی سی ہے، جنہوں نے ایک کشتی کے بارے میں قرعہ اندازی کی۔ بعض کو کشتی کے اوپر والے حصے میں جگہ ملی اور بعض کو نیچے والے حصے میں۔ نیچے والے حصے کے لوگوں کو پانی لینے کے لئے اوپر والے حصے میں جانا پڑتا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اگر ہم اپنے حصے میں شگاف کر لیں تو اچھا ہوگا۔ اس سے اوپر والے بھی زحمت سے بچ جائیں گے۔ اب اگر اوپر والوں نے نیچے والوں کو ان کے ارادے کی تکمیل کرنے دی تو سب کے سب غرق ہو جائیں گے اور اگر انہوں نے ان کو ایسا کرنے سے باز رکھا تو سب کے سب محفوظ رہیں گے۔''(۱)

یہ حدیث ایک تمثیل ہے۔ منطق میں اسے ''تمثیلی قیاس'' کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے فہم کی رعایت رکھتے ہوئے ایک اہم معاشرتی مسئلے کو ایک تمثیل کی صورت میں بیان فرمایا ہے۔ سطحی طور پر دیکھنے میں کشتی میں شگاف کرنے کی خواہش رکھنے والے بے گناہ معلوم ہوتے ہیں، لیکن اگر ان کی اس خواہش کے انجام بد کو پیش نظر رکھا جائے تو انہیں کسی صورت بے گناہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مذکورہ بالا حدیث شریف کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ دنیا سفینہ نوح علیہ السلام کی طرح

---

(۱) البخاری: الشرکة، ٦؛ المسند: ٤/٢٦٩، ٢٦٨

Marfat.com

ہے اور ساری کی ساری انسانیت بغیر کسی استثناء اور اختیار کے اس کشتی میں سوار ہے۔انسان اس دنیا میں رہنے پر مجبور ہیں۔دنیا کی یہ کشتی جس میں ہم رہ رہے ہیں اور ایک ساتھ تیر رہے ہیں صرف ایک ہی ہے، اس کے علاوہ کوئی اور کشتی ہمیں میسر نہیں، کیونکہ اس کشتی کا نظام چلانے کا اختیار صرف اسی کو حاصل ہے، جس نے ہمیں اس کشتی میں سوار کیا ہے، اس لئے کسی اور کو اس نظام میں تبدیلی کرنے یا مخل ہونے کا حق حاصل نہیں۔اس کشتی کی حفاظت اور پوری انسانیت کو غرق ہونے سے بچانے کی ذمہ داری بلا استثناء اس کشتی میں سوار ہر فرد پر عائد ہوتی ہے۔یہاں ذاتی زندگی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔اس عظیم ذمہ داری کا بوجھ کشتی کے سوار ہونے کی حیثیت سے ہمارے کندھوں پر ڈالا گیا ہے، اس لئے ہمیں لاکھوں انسانوں کو محض اس بنیاد پر فنا کے گھاٹ نہیں اترنے دینا چاہئے کہ ہم تو اپنے ذاتی کاموں میں مصروف ہیں۔ہمیں دوسروں کے معاملات میں پڑنے کی فرصت ہی نہیں، بلکہ ہمارا فرض بنتا ہے، ہم دنیا کی کشتی میں شگاف ڈالنے اور اجتماعی زندگی کو بگاڑنے والے ہر شخص کا مقابلہ کریں۔ہمیں معاشرے کو برائیوں کے نقصانات سے بچا کر انسانیت کی شرور و فتن سے حفاظت کرنی چاہئے، نیز امر بالمعروف کے ذریعے معاشرے میں اچھی عادات اور عمدہ خصائل کو عام کرنا چاہئے۔جو معاشرہ فطرتِ سلیمہ کے مطابق پروان چڑھتا ہے، وہ ہر قسم کی برائیوں سے پاک ہوتا ہے۔

یہ تو مسئلے کا ایک پہلو تھا۔مسئلے کا دوسرا پہلو فضائل کا حصول اور نیکیوں کو معاشرے میں ترویج دینا ہے۔یہ بھی ایک مشکل، لیکن مقدس معاشرتی فریضہ ہے۔

مروت کا تقاضا ہے کہ اگر کوئی شخص ایمانی حلاوت کے مزے سے آشنا ہو تو دوسروں کو بھی اس میں شرکت کا موقع دے۔مؤمن تو سراپا مروت ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی فکر میں لگا رہتا ہے۔جب وہ موسمِ بہار کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے تو اس لذت میں دوسروں کو بھی اپنے ساتھ شریک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔مؤمن دوسروں کو زندگی دینے کی خاطر اپنی زندگی کی محبت سے دستبردار ہو جاتا ہے۔جس شخص کے دل میں نورِ ایمان جاگزیں ہو جائے وہ جامد و ساکن نہیں رہ سکتا، بلکہ ایسی حالت اسے معرفت کے طلب گار دلوں کی جستجو میں بازاروں میں اور گھر گھر پھراتی ہے،

Marfat.com

جوایک اعتبار سے خود اس کے اپنے وجود کی بھی ضامن ہے، کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی تا آخرِ زیست ایمان کی حفاظت اور ایمان کے ساتھ قبر میں اترنے کا ضامن ہے۔ جو شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے محروم ہے اس کے ایمان کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی، اس لئے ہر مومن کا فرض بنتا ہے کہ اور نہیں تو کم از کم اپنی ذات کی نجات کے لئے اس فریضے کو ادا کرتا رہے۔

۹- دعوت و تبلیغ، نُصرتِ دین کا پیمانہ

دین اسلام کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے اٹھا رکھا ہے۔ وہ قیامت تک اس کی حفاظت فرمائیں گے اور اس کی تر و تازگی اور حسن و جمال کو برقرار رکھیں گے لیکن دین کی یہ حفاظت اہل ایمان کی ہمت اور دین کے ساتھ ان کی وابستگی و وارفتگی پر موقوف ہے۔ دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ نے دین کی حفاظت کے اپنے وعدے کو مسلمانوں کے اپنے دین کی نصرت و حمایت کے ساتھ عادۃً مشروط کر رکھا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کے وعدے کو اسی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہئے کہ جب تک مشیت ایزدی اور مذکورہ بالا عمومی شرط پائی جائے گی دین محفوظ رہے گا۔

اہل ایمان کو دین کا محافظ بن کر رہنا چاہئے۔ اگر وہ دین کا دفاع اور آفاقِ عالم میں اس کی اشاعت نہیں کریں گے تو اس کے فیوض و برکات سے محروم رہیں گے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی نصرت و حمایت چھوڑ دی ہے، بلکہ مسلمانوں نے دین کی حفاظت کی خاطر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف رجوع ہی نہیں کیا۔ بالفاظِ دیگر مشیت ایزدی کے حصول کے لئے عمومی شرط کے طور پر جو عزم و ارادہ مطلوب تھا اس کا فقدان ہے، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کا شیرازہ بکھیر کر انہیں ذلیل و رسوا اور دین کے فیوض و برکات سے محروم کر دیا ہے۔ اپنی زندگی کے انحطاط کو اسی زاویے سے دیکھنا چاہئے، کیونکہ جس قدر مسلمان دین پر عمل پیرا ہوں گے اور اس کی مدد و حمایت کریں گے اسی قدر دین محفوظ رہے گا اور جس قدر چہار دانگِ عالم میں اس کی نشر و اشاعت کے لئے جد و جہد کریں گے اسی قدر یہ سربلند اور ثمر آور ثابت ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ نے اس دین کی نصرت اور دفاع کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس کی حفاظت

Marfat.com

فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد ہر دور میں اس کے دفاع اور حفاظت کی ذمہ داری مسلمان اٹھاتے چلے آئے، لیکن جب سے مسلمانوں نے دین کو پس پشت ڈالا اور دینی معاملات میں غفلت برتنے لگے اللہ تعالیٰ نے انہیں ذلیل ورسوا کر دیا۔ دین کی نصرت اور حفاظت کرنا نبی اکرم ﷺ کے اہم ترین مقاصد میں سے تھا۔ آپ ﷺ نے اپنی امت کو بھی اس مقصد کی خاطر تیار کرنے کے لئے بڑی جدوجہد کی۔ آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ کی کامیابی کا حصول دنیا میں دین کے مطابق زندگی بسر کرنے پر موقوف ہے۔ روز محشر میں، پل صراط کے اوپر سے گزرتے وقت، جنت میں اور دیدارِ خداوندی کے لئے جو چیزیں سب سے زیادہ کارآمد ہوں گی وہ خدمتِ دین، اعمالِ صالحہ اور پاکیزہ دل ہیں۔

مسلمانوں کو اس قسم کا "پاسپورٹ" عطا کرنے کے لئے حضور ﷺ کا یہ اسوہ حسنہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت وارشاد آپ ﷺ کی اولین ترجیح تھی۔

حفاظت دین کا یہ شعور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بھی بیدار تھا، اس لئے انہوں نے اپنی ہر چیز کی قربانی دے کر دین کی حفاظت اور اس کا دفاع کیا۔ ان کی یہ قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں، بلکہ ان کی بدولت اللہ تعالیٰ نے دین کی حفاظت کا انتظام فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کی تربیت کے نتیجے میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین دنیا کے دور دراز علاقوں تک دین کی دعوت پہنچانے کے لئے مسابقت کیا کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے بعض صحابہ کرام کو صرف چند ایک آیات اور احادیث ہی یاد ہوں، لیکن انہوں نے اپنے علم کے مطابق زندگی گزاری اور دین کو چہار دانگ عالم میں پھیلانے کے لئے تگ ودو کی۔

مدینہ منورہ سے کچھ لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دین کی تعلیم کے لئے کسی صاحب کو مدینے بھیجنے کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے اس مقصد کے لئے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ آپ اکیلے تھے۔ آپ کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا۔ آپ مدینے میں ایک مسلمان کے پاس بطور مہمان ٹھہرے۔ مدینے کے اہم اہم لوگ روزانہ آپ کے پاس آتے۔ کبھی اسید بن حضیر، کبھی سعد بن عبادہ اور کبھی سعد بن معاذ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ آپ انہیں دین کی باتیں

Marfat.com

سکھاتے، جنہیں وہ بڑے غور سے سنتے تھے۔ (۱)

حضرت مصعبؓ کے پاس جو شخص ناراض و نالاں ہو کر آتا آپؓ اس کے ساتھ انتہائی نرمی کا برتاؤ کرتے۔ جو شخص آپ کے پاس مسلح ہو کر آتا واپسی پر ایمان کی دولت سے مالا مال ہو کر جاتا۔ مستقبل میں یہی لوگ رسول اللہ ﷺ کے صحابی بننے والے تھے۔ آپ کی نرم خوئی، ملاطفت اور دھیمے پن کے سامنے سخت سے سخت مزاج انسان بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ مثلاً آپ اُس سے کہتے: ''کیا آپ بیٹھ کر میری بات سننا پسند فرمائیں گے؟ اگر آپ کو میری بات اچھی لگے اور پسند آئے تو اسے قبول کرلیں، اگر آپ کو کوئی بات ناگوار گزرے تو ہم اسے قبول کرنے پر آپ کو مجبور نہیں کریں گے۔ خدا کی قسم! اگر آپ میری گردن بھی کاٹ دیں، تب بھی میں آپ کے مقابلے میں نہیں آؤں گا۔'' اس طرح اس نڈر اور عظیم داعی کے سامنے سے رکاوٹیں ہٹتی گئیں۔ آپؓ کو صرف ایک ہی فکر تھی کہ کسی طرح حق بات لوگوں تک پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے آپ کا دائرہ اثر وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور جنگ بدر تک آپؓ کی زندگی اسی طرح اللہ کی طرف لوگوں کو بلاتے ہوئے گزر گئی۔ احد کے موقع تک صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیاں دعوت و تبلیغ کی سرگرمیوں میں ہی گزریں، لیکن جنگ احد کے موقع پر دین کی حفاظت کے لئے انہیں تلواریں بھی اٹھانی پڑیں، کیونکہ جس طرح دعوت و تبلیغ ضروری ہے اسی طرح دین کی حفاظت بھی ضروری ہے، چنانچہ حضرت مصعب بن عمیرؓ نے یہ فریضہ بھی سرانجام دیا۔ آپؓ شام تک ایسی جرأت و بہادری کے ساتھ لڑتے رہے کہ فرشتے بھی آپ کی بہادری پر رشک کرنے لگے، لیکن آخرکار بے خبری میں ایک کافر کی تلوار کے خطرناک وار کے نتیجے میں آپ زمین پر آگرے، لیکن فوراً ہی ایک فرشتے نے حضرت مصعبؓ کی صورت اختیار کر کے انہیں کے انداز میں حملے جاری رکھے۔ شام کے وقت رسول اکرم ﷺ نے انہیں دیکھ کر پکارا: ''اے مصعب!'' تو فرشتے نے جواب دیا: ''اے اللہ کے رسول میں مصعب نہیں ہوں...'' اس وقت صحابہ کرام کو معلوم ہوا کہ مصعب تو کافی دیر ہوئی شہید ہو چکے ہیں۔

---

(۱) ابو نعیم: الحلیۃ، ۱/۱۰۷؛ ابن سعد: الطبقات، ۱/۲۲۰

Marfat.com

جنگ کے اختتام پر رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کی ایک جماعت کے ہمراہ حضرت مصعبؓ کی لاش کے پاس تشریف لائے تو دیکھا کہ آپ کے دونوں بازو کٹ چکے ہیں اور ایک کاری ضرب کے نتیجے میں آپ کا سر گردن سے جدا ہو چکا ہے، صرف چند ریشوں کے ذریعے سر مبارک آپ کے کندھوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔[1] آپؓ نے اپنا چہرہ اپنے پاکیزہ خون سے رنگین مٹی میں چھپا رکھا تھا۔ گویا آپ کو اندیشہ تھا کہ آپ ﷺ کو ان کی پراگندہ لاش دیکھ کر تکلیف ہوگی اس لئے آپ نے اپنا چہرہ چھپالیا تا کہ رسول اللہ ﷺ یہ دلخراش منظر نہ دیکھ پائیں یا آپ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا اطمینان کر چکنے اور آپ کی حفاظت ودفاع کے فریضے کی ادائیگی کی تکمیل سے پہلے شہید ہو جانے پر شرمندہ تھے۔[2]

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ایسی شجاعت اور عالی ظرفی کا مظاہرہ کرنے میں تنہا نہ تھے، بلکہ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اس شعور اور جذبے سے سرشار تھے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کے ذریعے اپنے دین کی حفاظت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ دین کی حفاظت فرماتے رہے، یہاں تک کہ مسلمان انتشار کا شکار ہو گئے۔ انحطاط کے اس دور میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو دین کی بہت کچھ خیر وبرکت سے محروم کر دیا، جنہوں نے اس کی حمایت وحفاظت کی کوشش نہیں کی۔ اس لئے ہم اس دین کے دعوے دار اسی وقت تک رہ سکتے ہیں، جب تک ہم اس کی حمایت ونصرت کرتے رہیں گے۔ جوں ہی ہم اس کی نصرت سے دستبردار ہوں گے یا اس کے دفاع میں سستی کا مظاہرہ کریں گے، اللہ تعالیٰ اس کے نورانی فیوض اور روحانی واردات سے ہمیں محروم کر دیں گے۔

جب تک بیت المقدس صلیبیوں کے قبضے میں رہا صلاح الدین ایوبی سالہا سال روتے رہے۔ ان کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ یا ہنسی کے آثار نہیں دیکھے گئے، یہاں تک کہ ایک دن خطیب نے جمعے کے خطبے میں مسکراہٹ اور ہنسی کی ضرورت پر تقریر کی تو صلاح الدین ایوبی نے نماز کے

(۱) ابن سعد: الطبقات، ۲/۲،۴۲/۳/۱۲۰۔۱۲۱

(۲) رجال حول الرسول: ص: ۵۲

Marfat.com

بعد خطیب کا ہاتھ پکڑ کر وہ بات کہی، جو تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے: ''شاید تمہارا اشارہ میری طرف تھا، لیکن خدا کی قسم! ذرا مجھے بتاؤ تو سہی کہ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کیسے آئے، جبکہ وہ مسجد جس سے نبی مصطفیٰ ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تھے، اللہ کے دشمنوں کے قبضے میں ہے؟'' بیت المقدس کی بازیابی سے پہلے امت کے اس عظیم سپوت کے پاس رہنے کے لئے صرف ایک خیمہ تھا۔ وہ کہا کرتا تھا: ''اللہ کے گھر دشمنوں کے قبضے میں ہوتے ہوئے میں کسی گھر کا کیسے مالک بن سکتا ہوں؟''

ہمارے اسلاف نے تو اس طرح دین کی حفاظت کی، جس کے نتیجے میں وہ دین ان کا دین کہلایا۔ اب ہمارا دور ہے اگر ہم نے اپنے دین کی حفاظت اور نشر واشاعت کی جو بلا استثناء ہم میں سے ہر ایک کا اہم ترین فریضہ ہے تو اللہ تعالیٰ بھی ہمارے دین کی حفاظت فرمائیں گے۔

ہر مؤمن کی یہ ذمہ داری ہے کہ پہلے خود دین کا علم حاصل کرے پھر اس کے مطابق اپنی پوری زندگی کو ڈھالے اور اس کے بعد دوسروں کی زندگیوں کو بھی منور کرنے کے لئے انہیں بھی دین کی باتیں بتائے۔ اسلامی اصولوں کی رو سے اس فریضے کا ہر مؤمن مکلف ہے۔

ذیل میں میں بعض ایسے مسائل کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جن کی طرف کما حقہ توجہ نہیں دی جاتی۔ یہ دور حاضر میں ہماری کسمپرسی کے بنیادی اسباب بھی ہیں:

اول: بتدریج دین سے بے اعتنائی

دوم: دینی خدمات کو صرف کسی خاص جماعت کی ذمہ داری سمجھنا اور اس بارے میں تمام امور اس جماعت پر موقوف قرار دینا۔ پہلے سبب کی طرح یہ دوسرا سبب بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رہنی چاہئے کہ دین کسی ایک جماعت تک ہر گز محصور نہیں رہ سکتا۔ دین پر کبھی بھی کسی گروہ کی اجارہ داری قائم نہیں ہونی چاہئے۔ دین پر اس کے تمام پیروکاروں کا حق ہوتا ہے۔ ہر ہر فرد کا اپنے رب کے ساتھ ربط اور تعلق ہوتا ہے۔ جس طرح بندے اور رب کے

Marfat.com

درمیان تعلق کو ختم نہیں کیا جا سکتا اسی طرح کسی مؤمن کو اس کے دین کی حفاظت وحمایت سے بھی باز نہیں رکھا جا سکتا۔ دینی خدمات کو کسی ایک جماعت کی اجارہ داری میں دے دینا بہت بڑی اور ناقابل معافی غلطی اور غفلت ہے۔ اس غفلت سے توبہ کئے بغیر موجودہ کربناک حالات سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ صرف اسی صورت میں نجات کی کوئی صورت ممکن ہو سکتی ہے۔ بصورت دیگر ہم غلبہ دین کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوں گے۔

دینی خدمات کو کسی ایک ادارے تک محدود کرنا غیرملکیوں کی ایک سازش ہے۔ اس قسم کا طرز عمل اسلام کے جہاد اور تبلیغ کے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ دین کی حیثیت سے اسلام کو جامع مسجد کی دیواروں میں محصور نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے تو اسلام کو دنیا و آخرت کو سنوارنے کے لئے بھیجا ہے۔ اسلام ایک ایسا جامع نظامِ حیات ہے جو تقسیم کو قبول نہیں کرتا۔

جس دن ہم مجموعی طور پر دین پر کاربند ہو گئے اور ہمارے دل اس سے مانوس ہو گئے اس دن ہمیں ذلت و پستی سے چھٹکارا نصیب ہو جائے گا۔ ہمارے انفرادی، اجتماعی اور انسانی معاملات تابناک وحی کی روشنی میں حل ہو جائیں گے، جس کے نتیجے میں انسان کو بے چینی و اضطراب سے خلاصی نصیب ہو گی۔

ایسے معاشرے کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ ہم دل و جان سے پوری طرح اس دین مستقیم پر عمل پیرا ہو جائیں، جس کی بنیاد رسول اکرم ﷺ کے ارشادات پر قائم ہے اور آپ ﷺ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے تھے، بلکہ جو کچھ ارشاد فرماتے وہ خدا کی وحی ہوتی تھی۔

میں پھر آپ سے کہتا ہوں کہ جب تک ہم اپنے دلوں کی کیفیت میں مثبت یا منفی تبدیلی نہیں لاتے اُس وقت تک اللہ تعالیٰ بھی ہمارے ظاہری حالات میں تبدیلی نہیں لاتے، چونکہ افراد کی اصلاح و بگاڑ پر معاشرے کی اصلاح و فساد موقوف ہوتی ہے۔ اس لئے معاشرے کے ہر ہر فرد کو صحیح معنی میں دین کا حامی و ناصر بنانے کے لئے اس کی درست تربیت انتہائی ضروری ہے۔

ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ صحت مند افراد سے صحت مند خاندان وجود میں آتا

Marfat.com

ہے اور صحت مند خاندانوں سے صحت مند معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ فرد اور اس کے بعد خاندان معاشرے کی بنیادی اکائی ہوتا ہے۔ اچھا معاشرہ افراد کی اصلاح کے بغیر جنم نہیں لے سکتا۔ صحت مند معاشرہ وہی معاشرہ کہلا سکتا ہے، جس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی پیروی کی جاتی ہو۔ معاشرے کی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تمام افراد کے دل نیکیوں سے آباد اور بدیوں سے پاک ہوں، لیکن یہ کام معاشرے کے افراد ہی سرانجام دے سکتے ہیں۔

اللہ اور اس کے رسول اکرم ﷺ نے تبلیغ کے اصولوں اور طریق کار کی وضاحت کر دی ہے۔ دعوت وارشاد کا جو کام ان اصولوں اور طریق کار کے مطابق نہیں ہوگا اس سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ اپنے درست طریق کار کے علاوہ کسی اور طریق کار کو پسند نہیں فرماتے اور جس بات سے اللہ تعالیٰ خوش نہ ہوں اس کا کوئی فائدہ نہیں، اگرچہ پوری دنیا اسے پسند ہی کیوں نہ کرے۔ جن لوگوں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت سے بہت قریب ہوتے ہیں۔ ہماری بدقسمتی کو وہی مبارک لوگ خوش قسمتی میں تبدیل کر سکتے ہیں، جو دین کی نصرت کرتے ہیں، رحمت خداوندی کا وافر حصہ انہیں عطا کیا گیا ہے اور وہ اپنی زندگی اسی کے مطابق گزارتے ہیں۔ میں ایک بار پھر کہتا ہوں: ''ہم دین کے ساتھ اسی قدر انتساب کا حق رکھتے ہیں، جس قدر ہم اس کی نصرت حمایت کرتے ہیں۔''

Marfat.com

Marfat.com

دوسری فصل

تبلیغ کے اصول وضوابط

۱- علم اور دعوت وارشاد کا باہمی تعلق

۲- اسلامی حقائق اور دورِ حاضر سے آگاہی کی اہمیت

۳- قرآن اور دل کا باہمی تعلق

۴- جائز ذرائع کا استعمال

۵- معاوضے کا مطالبہ

۶- مخاطب کے مزاج سے آگاہی اور افہام وتفہیم کے انداز کی اہمیت

۷- ایمان، تبلیغ اور عمل کے نقطہ نظر سے

۸- تزکیہ اور اخلاص کی اہمیت

۹- اہل ثروت واقتدار کے ساتھ تعلقات کا معیار

۱۰- مستقل مزاجی

۱۱- بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قوانینِ فطرت کی مخالفت سے اجتناب

Marfat.com

Marfat.com

ہر علم کی مخصوص تعریف ہوتی ہے اور ہر کام کا مخصوص اسلوب اور طریقِ کار۔ اس تعریف اور طریقِ کار کے بغیر علم کی کسی شاخ یا کام کی کسی نوع میں داخل ہونا ممکن نہیں ہوتا، چونکہ تبلیغ ہر مسلمان کا مقدس ترین فریضہ ہے، اس لئے لامحالہ اس کے بھی کچھ اصول اور اسالیب ہوں گے۔ تبلیغ کے جس کام میں ان اصولوں اور طریقِ کار کی رعایت نہیں رکھی جائے گی، وہ سعی لا حاصل کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اگر اس سے کامیابی حاصل ہو بھی جائے تو اس کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اپنے ضمن میں ناکامی لئے ہوتی ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم تبلیغ کے بعض اصول اور اسالیب تحریر کی صورت میں پیش کریں گے، لیکن پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہم دعوت وارشاد کے تمام اصول واسالیب ذکر نہیں کریں گے۔ جن اصول وضوابط کو ہم ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کریں گے وہ آیاتِ کریمہ اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں وضع کئے گئے ہیں، نیز ان میں ایسے لوگوں کے عملی تجربات کو پیش نظر رکھا گیا ہے، جنہوں نے عملی میدان میں انہیں آزمایا، بچپن سے دعوت وارشاد میں مصروف مشائخ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور وسیع پیمانے پر باضابطہ طور پر اس فریضے کو سرانجام دیا۔

بعض اوقات ہماری بعض تعبیرات زمینی حقائق سے ہم آہنگ محسوس نہ ہوں گی اسے ہماری کوتاہی وبے بضاعتی پر محمول کیا جائے۔ اس بارے میں ہمارا دستور العمل یہ رہا ہے کہ جن افکار کو زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اُن کو جی کر ہی زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ اُن پر عمل کرنا ہی زندگی ہے۔

۱۔ علم اور دعوت وارشاد کا باہمی تعلق

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو سرانجام دینے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ علم کے اسلحے سے لیس ہو، کیونکہ علم اور تبلیغ ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ داعی کو اپنے دین کے بارے میں اچھی طرح آگاہی ہونی چاہیے، ورنہ اسے بہت سی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑے گا، بلکہ مخاطبین کو اپنی ذات اور دین سے متنفر کرنے کا موجب بن جائے گا۔ ایسا نتیجہ اپنے اور دوسروں کے دینی ودنیوی حقوق کی پامالی کا سبب ہوگا۔

Marfat.com

اس فصل میں پہلے ہم علم کے عمومی مفہوم پر روشنی ڈالیں گے، اس کے بعد دعوت و تبلیغ، علم اور عمل کے باہمی تعلق کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے۔

سارے عالم وجود میں علم حضرت آدم علیہ السلام کی محراب ہے، علم نے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی صورت اختیار کی تو آپ علیہ السلام اس میں سوار ہو گئے۔ علم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات میں وحی الٰہی کے دریا کی صورت میں ظاہر ہوا۔ علم نے ایک بار پھر جسم کا لبادہ اوڑھا تا کہ کوہ طور حضرت موسی علیہ السلام میں یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور میں ظاہر ہوں، اسی لیے کائنات میں جو بھی قالب ہے اس کی روح علم ہے۔

علم کیا ہے؟ علم اپنی ذات کی معرفت کے بعد اپنے پروردگار کی معرفت کا نام ہے۔ علم اپنے نفس کے آئینے میں اُن خدائی صفات واسماء کے مشاہدے کا نام ہے، جن کا انکشاف انسان کو اپنے رب کی معرفت و علم کی راہ میں اپنے احساسات کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہی حقیقی علم ہے، جسے شاعر یونس امرۃ نے اپنے درج ذیل شعر میں بیان کیا ہے:

العلم هو أن تعرف   أن تعرف نفسك

حقیقی علم وہ ہے، جس سے تو جانے   کہ تجھے اپنی ذات کی آگاہی حاصل ہے

فاذا لم تعرفها   فالعفاء على ماقرأت

جس علم سے اپنی ذات کی آگاہی حاصل نہ ہو   اُس علم کا کوئی فائدہ نہیں

"مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ" "جس نے اپنی ذات کی معرفت حاصل کر لی اس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا۔" یہ بڑی پرمغز اور بامعنی بات ہے۔ یہ اگرچہ حدیث نہیں، لیکن اس میں حدیث کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اپنی حقیقت اور معنویت کے اعتبار سے یہ بیش بہا اور سنجیدہ دستور العمل ہے، جس کی تائید قرآن کریم کی درج ذیل آیت مبارکہ سے بھی ہوتی ہے:

"وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ۔" [الحشر:١٩]

"اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے انہیں ایسا کر دیا کہ خود اپنے تئیں بھول گئے۔"

Marfat.com

اگر تم نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ تمہیں تمہاری ذاتیں فراموش کرادے گا اور اس خودفراموشی کے باعث تم خدا سے دور ہوتے چلے جاؤ گے۔ یہ ایک منحوس دائرہ ہے، جس میں ایک سے دوسرا دائرہ پیدا ہوتا ہے، جو ایک بار اس منحوس دائرے میں پھنس جائے، اس کا اس سے نکلنا بہت مشکل ہوجاتا ہے اور انسان انحطاط کا شکار ہوتے ہوتے فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ اس آیت کریمہ کو ایک دوسرے پہلو سے بھی سمجھا جاسکتا ہے:

''اللہ تعالیٰ کو فراموش کرنے سے بچو اس لئے کہ اس سے تم ''خودفراموشی'' کا شکار ہوجاؤ گے۔''

جس کے نتیجے میں تم صرف خارجی دنیا میں منہمک ہوکر رہ جاؤ گے۔ تمہاری نظر صرف آفاق پر ہی پڑے گی۔ تم اپنے بارے میں غور و فکر اور اپنی ذات کے محاسبے سے غافل ہوجاؤ گے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بعض لوگ اسلام اور قرآن کریم کی باتیں کرتے ہیں، لیکن دوسروں سے ان کے احکامات پر عمل پیرا ہونے کے منتظر رہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کے خاندان کے قریب ترین افراد آپ کے گھر میں اعلانیہ طور پر دینی احکامات میں غفلت برتتے اور انہیں حقیر سمجھتے ہوں، لیکن دوسروں سے اپنے ارادوں کی تکمیل کی خواہش کی وجہ سے آپ کو اپنے ایسے قریب ترین افراد نظر نہیں آتے۔ کتنے ایسے غمزدہ لوگ ہیں، جو اسلام کے لئے نعرے بازی اور گلی کوچوں میں جلوس تو نکال لیتے ہیں، لیکن ساتھ ساتھ شیطان کے نقش قدم پر چلتے ہیں، اپنے نفس کے محاسبہ سے غافل ہوکر خودفراموشی کا شکار ہوجاتے ہیں، انہیں اپنے پروردگار کے ساتھ قائم تعلق کا جائزہ لینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

کوہ پیماؤں کی طرح ہمیں بھی بڑی احتیاط سے ایک ایک قدم پھونک کر رکھنا چاہئے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہم نے کہاں کمند ڈالنی ہے اور کہاں رسی باندھنی ہے۔ معمولی سی غلطی بھی جان لیوا ہوسکتی ہے۔

کیا یہ بات باعث تعجب نہیں کہ انسان عبادت گاہوں اور مساجد حتیٰ کہ خانہ کعبہ اور روضہ اطہر میں بھی اپنے آپ کو فراموش کردیتا ہے۔ مجھے بڑے افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑ رہا ہے

Marfat.com

کہ ہم میں سے بے شمار لوگ ایسی جگہوں پر بھی خود فراموشی کا شکار ہو جاتے ہیں۔اے خدایا! یہ کتنے نقصان کی بات ہے!

علم کی ایک غایت ہے۔یہ غایت اللہ تعالیٰ کی معرفت اور محبت کا حصول ہے۔جو علم انسان کے دل میں محبت کی آگ لگائے اور نہ ہی اس کی روحانی طور پر انگیخت کرے وہ بامقصد علم نہیں کہلا سکتا۔بامقصد علم ہی ہمارے لطیف جذبات کا رازِ حیات اور ہمارے احساسات کو مہمیز کرنے کا ذریعہ ہے۔اس کے بغیر روحانی موت واقع ہو جاتی ہے۔قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں جس علم کی ترغیب آئی ہے وہ یہی بامقصد علم ہے جو حقیقی علم ہے۔

ہماری گفتگو کا بنیادی موضوع نہ ہونے کے باوجود ہم اس موضوع پر گفتگو میں مشغول ہو گئے، لیکن اس کے باوجود میں علم سے متعلق بعض قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ پر کچھ روشنی ڈالنا چاہوں گا:

۱: "قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ." [الزمر:۹]

"کہو بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔"

یعنی کیا جو علم انسان کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ تک رسائی دیتا ہے اور جو علم اسے تجربہ گاہ کا قیدی بنا دیتا ہے برابر ہو سکتے ہے؟ کیا ایسے شخص کا علم جو دوربین کے ذریعے اللہ تعالیٰ تک رسائی کی خاطر ستاروں کا مطالعہ کرتا ہے اس علم کے برابر ہو سکتا ہے، جو ماہر فلکیات کو ستاروں اور ان کے نظاموں کی بھول بھلیوں میں گم کر دیتا ہے؟ زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ کیا مذکورہ بالا دو مختلف نقطہ ہائے نظر کے مالک افراد برابر ہو سکتے ہیں؟

بعض لوگوں کی ساری زندگی سربستہ رازوں کی جستجو میں کتب بینی اور حواشی و شروح کی تحریر میں گزر جاتی ہے، لیکن انہیں حقیقی علم کی ایک سطر بھی پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ایسے علماء کے بارے میں ہی قرآن کریم نے کہا ہے کہ ان کی مثال ایسے ہے جیسے گدھے پر کتابوں کا بوجھ لاد دیا جائے۔ایسے انسان کو اس انسان سے کیا نسبت جو ایک سطر پڑھتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس پر عالم

Marfat.com

بالا کے اسرار منکشف ہوجاتے ہیں۔وہ ہر آن ایک قسم کی روحانی مستی ونشاط سے مسرور رہتا ہے۔میرے خیال میں ان دونوں علموں میں وہی نسبت ہے جو ''لاشی''' (کچھ بھی نہیں)اور ''سب کچھ'' کے درمیان ہوتی ہے۔اللہ تک پہنچانے والا علم ''سب کچھ ہے'' اور جو علم راستے میں ہی ساتھ چھوڑ جائے وہ ''لاشی''' (کچھ بھی نہیں) ہے۔

۲: اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ [فاطر:۲۸]

''خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔''

اس آیت مبارکہ میں واضح الفاظ میں علم کی قسمیں اور علماء کی تعریف وتوصیف ہے،لیکن اس تعریف کے صرف وہی علماء مستحق ہیں، جو اپنے علم کی بدولت اپنے پروردگار کے حضور خشوع کے ساتھ دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ہر علم کا اپنا وزن اور اہمیت ہوتی ہے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:''علماء انبیاء کے وارث ہیں۔''(۱)

صرف انبیائے کرام ہی حقیقت کا اصلی حالت میں ادراک کر سکتے ہیں۔ہم صرف ان کے کلام کی روشنی میں حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔کسی بھی انسان کے لئے بغیر کسی نبی کی رہنمائی کے مطلق حقیقت (Absolute Reality) تک رسائی ممکن نہیں۔یہ ممکن ہے کہ کوئی انسان اپنی ذاتی سعی وکاوش سے درستی کے قریب کے بعض حقائق کا انکشاف کر لے،لیکن ''مطلق درستی'' تک رسائی انبیائے کرام علیہم السلام کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں۔اللہ تعالیٰ کے حقیقی نائبین انبیائے کرام ہیں۔ان کے بعد اللہ کے نیک بندوں کا مرتبہ ہے۔قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ کے اُن نیک بندوں کی طرف اشارہ ملتا ہے، جو زمین کے حقیقی وارث ہیں۔مذکورہ بالا حدیث اور اس آیت مبارکہ میں بڑی گہری مناسبت پائی جاتی ہے،جس کے مطابق صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نیک بندے ہی دنیا کی خلافت کے مستحق ہیں اور وہی انبیاء کے حقیقی وارث ہیں، چونکہ نبی حق بات کا ترجمان ہوتا ہے،اس لئے جو شخص جس قدر حق بات کا ترجمان ہوگا وہ اسی قدر انبیاء کا حقیقی نائب ہوگا۔

عالم کی دیگر لوگوں پر فضیلت درج ذیل حدیث سے بھی واضح طور پر ثابت ہوتی ہے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

---

(۱) البخاری: کتاب العلم، ۱۰؛الترمذی: کتاب العلم، ۱۹

Marfat.com

"فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلَى أَدْنَاكُمْ"

"عالم کو عابد پر ایسے ہی فضیلت حاصل ہے جیسے مجھے تم میں سے ایک ادنیٰ آدمی پر۔"(۱)

جاہل عبادت گزار کے گمراہ ہونے کا ہر وقت اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ انحراف انسان کے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں مرتبے کے لحاظ سے ایک نسبی امر ہے۔ بعض لوگ ایک لحظہ کے لئے بھی اللہ کے دھیان سے غفلت کو شدید انحراف سمجھتے ہیں۔ اس بات کے نسبی ہونے کے باوجود کسی نہ کسی درجے میں بہرحال انحراف پایا جاتا ہے، جبکہ انبیائے کرام کے حقیقی وارث علمائے کرام جو ہمیشہ اللہ کی یاد اور اپنے نفس کے محاسبے میں مشغول رہتے ہیں وہ روحانی اعتبار سے ہمیشہ مامون ومحفوظ رہتے ہیں۔ ان میں خطرات سے بچنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یقیناً پوری معرفت اور شعور کے ساتھ عبادت کرنے والا عالم بغیر شعور کے عبادت گزار سے ایسے ہی افضل ہے جیسے رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام میں سے ایک ادنیٰ صحابی سے افضل ہیں۔ حقیقت میں ان دونوں حالتوں کے درمیان کوئی نسبت ہے ہی نہیں۔

یہاں ایک بڑا مفید نکتہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کا وارث حضیرۃ القدس سے جاری نور سے کبھی محروم نہیں رہتا۔ وہ انسانِ کامل ہوتا ہے۔ اس کی مثال اُس عدسے کی سی ہوتی ہے، جو سورج سے نکلنے والی شعاعوں کو جذب کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ وہ اُس مقدّس فیض کے ایک ذرّے کو بھی ضائع نہیں ہونے دیتا جو اَحدی اور لطیف جمالی تجلیات کی صورت میں اسے رحمت خداوندی سے ڈھانپے رکھتا ہے۔ اس کے دل کے تمام گوشے ہمیشہ پرنشاط اور فعال رہتے ہیں۔ وہ اِن خدائی فیوض وبرکات کو منعکس کرنے والا آئینہ بننے کی سعی میں لگا رہتا ہے۔

نیز اس میں نبی کے وارث اور انسانِ کامل کی سی عاجزی وانکسار اور اپنے پروردگار کے سامنے مکمل تعظیم کا بھی اظہار ہے۔ اس طرح ہمیشہ روح کو غذا فراہم ہوتی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ روحانی غذا کے منتقل ہونے کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے، جس میں انسان اپنی روح کے نور، روشنی اور دیگر حقائق کو اپنے گردوپیش کے لوگوں کی طرف منتقل کرتا ہے۔ اس کام کے لئے کوئی خاص معیار

(۱) الترمذی: کتاب العلم، ۱۹

Marfat.com

نہیں، بلکہ روح کی گہرائی کے اعتبار سے اس کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔لہٰذا ایک عابد اپنی عبادت میں چاہے کتنا ہی منہمک کیوں نہ ہو وہ ایک عالم (جو انسانِ کامل ہوتا ہے) کی عبادت کو نہیں پہنچ سکتا۔ ہر انسان کو اپنے علم کے مطابق عمل کرتے رہنا چاہیے، ورنہ وہ قرآن پاک کی درج ذیل وعید کے ضمن میں داخل ہو جائے گا:﴿وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ ”مگر ایک فریق ان میں سے سچی بات کو جان بوجھ کر چھپاتا ہے۔“ [البقرة:١٤٦]

جو لوگ اپنے علم پر عمل نہیں کرتے وہ ایسے سیاہ ستاروں کی مانند ہیں، جن سے روشنی منعکس نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے ان کی ”نوری طاقت“ سے استفادہ ممکن نہیں ہے۔ زیادہ درست الفاظ میں سورج کی طرح ان کی روشنی ہر طرف نہیں پھیلتی، سورج تو ایک روشن چراغ ہے، جو ایسے بہت سے رنگوں کا مجموعہ ہے، جس کے سیاروں کی مانند پھول ایک دوسرے کو چھو رہے ہیں۔ ایسے بدقسمت لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہیے، جو توانائی کے ذخیروں کے ہوتے ہوئے بھی تاریک سیارے کی مانند بے نور ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ”کسی شخص سے ایسی بات پوچھی گئی جس کا اسے علم بھی تھا، لیکن پھر بھی اس نے اسے چھپا لیا تو اسے قیامت کے دن آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔“[1]

یہ حدیث مبارک اپنے اندر بڑی جامعیت و معنویت رکھتی ہے، یعنی جس شخص نے کوئی بات سیکھنے کے بعد اسے دوسروں تک پہنچانے کی کوشش نہ کی، کچھ حاصل کرنے کے بعد اسے دوسروں کی طرف منتقل نہ کیا، اپنے کردار کے ذریعے دوسروں کے لئے عملی نمونہ پیش نہ کیا اور حق بات کو منعکس کرنے والا آئینہ نہ بنا تو اسے سزا کے طور پر آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔ اس حدیث شریف میں بڑی سخت ڈانٹ اور توبیخ ہے، کیونکہ لگام تو صرف جانوروں کو پہنائی جاتی ہے، گویا اس حدیث شریف میں اپنے علم کو چھپانے والے شخص کو جانوروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس تعبیر کی سنگینی بالکل واضح ہے۔

---

(١) الترمذی: کتاب العلم،٣؛ ابو داؤد: العلم،٩؛ ابن ماجه؛ المقدمة،٢٤؛ الهیثمی، مجمع الزوائد،١/١٦٣

Marfat.com

کتمانِ حق کرنے والے شخص کو درحقیقت اپنی خداداد صلاحیتوں اور اپنے احسنِ تقویم ہونے کی قیمت کا ادراک ہی نہیں۔ اس نے اللہ کی طرف سے اپنی ذات میں ودیعت اس شعور، طاقتِ بیان اور قوتِ تفکیر کو نظرانداز کر دیا جس کی وجہ سے اسے نہ صرف حیوانات سے امتیاز حاصل ہوا ہے، بلکہ وہ تمام مخلوقات میں ممتاز اور بااختیار مقام کا مستحق قرار پایا ہے۔ اس نے خدا کی مذکورہ بالا نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا۔ اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ سزا کے طور پر اس سے اپنی نعمتیں چھین لیں تو یہ بالکل منصفانہ فیصلہ ہوگا۔

آپ لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کے لئے میں ایک اور بات بھی عرض کرنا چاہتا ہوں:
علم اور تبلیغ درحقیقت ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں، جبکہ عمل ان دونوں کے لئے لازمی شرط ہے۔ ان تینوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ کسی شخص کا اپنے علم پر عمل کرنا درحقیقت اپنے علم کا احترام کرنے کے مترادف ہے، جبکہ اپنے رب کی معرفت کے بعد بھی اس کی عبادت نہ کرنا نہ صرف اس کی عزت سے انکار کرنا ہے بلکہ بے وقوفی اور اندھا و بہرا پن ہے۔ خاص طور پر خدمت اسلام کے علمبرداروں کا عبادت میں سستی کرنا بیرونی دشمن سے زیادہ خطرناک ہے۔ قبولِ اسلام کے بعد اہل مغرب جس حالت سے آزردہ خاطر نظر آتے ہیں اور جن باتوں کا وہ اظہار کرتے ہیں وہ میری بات کی تائید کرتی ہیں۔ دشمن کی بات اور گواہی کا اپنا ایک وزن ہوتا ہے۔
ایک مسلمان انگریز سے کسی نے پوچھا کہ انگریز بڑی عقل مند قوم ہے، یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا کی سیاست پر وہ حاوی نظر آتے ہیں، لیکن وہ کثیر تعداد میں اسلام کیوں نہیں قبول کرتے؟ اس کے جواب میں وہ مسلمان انگریز اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے قریب کی ایک مسجد میں لے گیا، جس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہاں چند ایک لوگ صرف جسمانی طور پر عبادت میں مشغول تھے۔ یہ اس کا جواب تھا، جس کا حاصل یہ ہے کہ مغربی انسان کا تمام دینی اور غیر دینی نظاموں کے بارے میں موقف بالکل واضح ہے کہ وہ کسی ایسے نظام کو قبول نہیں کرتے جس کی زندگی میں عملی تطبیق ممکن نہ ہو، لہٰذا جب بھی ہم نے اپنے آپ کو ان کے سامنے ایک ایسی جماعت کے طور پر پیش کیا، جس کے

Marfat.com

ظاہر و باطن میں ہم آہنگی ہو، جس میں عقل اور روح دونوں بدرجہ اتم موجود ہوں، جس کے دل کے دریچے قرآن فہمی کے لئے ہمیشہ وا رہتے ہوں، جس کا کردار انسانی فطرت کے مطابق ہو اور جس کے ہر فرد کو انسانیت کی ہدایت کی فکر ہو تو وہ اسلام قبول کرنے لگ جائیں گے۔ ماضی میں ایسا ہو بھی چکا ہے اور ان شاء اللہ مستقبل میں بھی وہ ہمارے کہے بغیر خود ہی اسلام قبول کرنے لگ جائیں گے۔

مغربی شخص ایسے معاشرے کو کیسے قبول کرے، جسے نہ اپنے دین کی خبر ہے، نہ اپنے پروردگار کی معرفت حاصل ہے، نہ خدا کی کتاب کا کچھ فہم ہے اور نہ ہی وہ پرکشش مظاہر کا مالک ہے۔ مغربی شخص تو سب سے پہلے عملی صورتِ حال اور مسلمان کی قلبی و عقلی تربیت کو جانچتا ہے۔ اسے تو ایسے لوگ پسند ہیں، جن کے دل میں انسانیت سے محبت اور شفقت کے جذبات موجزن رہتے ہوں۔ وہ اپنی راتیں تہجد میں اللہ کے حضور کھڑے ہو کر گزارتے ہوں۔ ان کی زبانیں اللہ کے ذکر سے تر رہتی ہوں۔ وہ اپنا کوئی لحظہ ضائع نہ ہونے دیتے ہوں، بلکہ اپنے ہر لمحے کو مفید اور نفع بخش کاموں میں صرف کرتے ہوں۔ اہل مغرب کے دل میں صرف مذکورہ بالا صفات کے حامل لوگوں کی ہی قدر ہوتی ہے۔

جب کبھی بھی مسلمانوں نے مذکورہ بالا اوصاف کو اپنا لیا تو اہل مغرب جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگ جائیں گے، لیکن موجودہ صورتِ حال چونکہ اس کے برعکس ہے، اس لئے نتیجہ بھی برعکس ہی ہے کہ اہل مغرب ہم سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اسلام ایک ایسا خدائی نظام ہے، جو علم اور عمل کے درمیان گہرا ربط قائم کرتا ہے۔ اس کا ایک پہلو اگر ایمان ہے تو دوسرا پہلو اس ایمان کو عملی زندگی میں لانا ہے۔ یقیناً دوسروں کے کاموں اور عبادات کا تذکرہ اور ان کی حکایات بیان کرنا اس پہلو سے مفید ہے کہ ان میں عبرت ونصیحت کے بہت سے موتی ہوتے ہیں، لیکن ان باتوں کو عملی زندگی میں اپنائے بغیر صرف اسی پر اکتفاء کر لینے کا منفی اثر پڑتا ہے۔ اسلام صرف اولیائے کرام کے مناقب کا تذکرہ کرنے اور سننے کا نام نہیں ہے، بلکہ اسلام تو اپنی زندگیوں کو ان کے اسوہ حسنہ کے مطابق ڈھالنے سے عبارت ہے۔ اسلام ایمان اور عمل کا مجموعہ ہے، لہٰذا جو لوگ اس بات کے ادراک کے بغیر اسلامی نظام کی بات کرتے

Marfat.com

ہیں ان کی گفتگو بالکل بے معنی ہے۔

۲- اسلامی حقائق اور دورِ حاضر سے آگاہی کی اہمیت

دورِ حاضر میں اشیاء کی قدر و قیمت لگانے اور واقعات کو پرکھنے کے معیار یک لخت تبدیل ہو چکے ہیں۔ اصلاح کے معاملے میں منطق و عقل پسندی کو باقی ہر چیز پر فوقیت حاصل ہے۔ کفر اور بے دینی کو سائنس اور فلسفے کے رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کو بھی اسی اسلوب میں ان کا جواب دینے کی ضرورت ہے، لیکن اس کے لئے اپنے دور کے علوم سے گہری واقفیت ناگریز ہے۔ علم و عرفان جو ایک مسلمان کی بنیادی خوبی ہے، سے بھی یہی مراد ہے۔

اپنے زمانے کے تقاضوں اور رفتار سے ناواقف شخص کی مثال تاریک راستے کے راہی کی سی ہے، جس کی دوسروں تک دین وایمان کی بات پہنچانے کی تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی، کیونکہ جلد یا بدیر حوادثِ زمانہ کے تھپیڑے ان کے اثرات مٹا دیں گے، لہٰذا مسلمان کو چاہیے کہ وہ دوسروں کے سامنے اپنی بات مناسب اور منظم انداز میں اپنے دور کے فکری، علمی اور تہذیبی معیار کے مطابق پیش کرے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج کے دور میں جو مرشد اور داعی مذکورہ بالا نقطے کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو گیا وہ آخرت میں اولیاء واقطاب پر سبقت لے جائے گا۔ یہ بات اتنی اہم ہے کہ ایسے شخص کو انبیائے کرام کے پیچھے جگہ ملے گی، تاہم یہ کام جس قدر وقت کی ضرورت ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔

اپنے زمانے سے ناواقف شخص زیر زمین رہنے والوں کی طرح ہے، جبکہ مبلغ یا داعی تو کھلی فضاؤں میں رہتا ہے۔ اس کی عقل کی پرواز اسے ستاروں پر لے جاتی ہے۔ وہ اپنے دل اور دیگر حواسِ باطنہ کے ذریعے جنت کے باغات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یعنی جب اس کی عقل "Lauis Pasteur" کی معیت میں اسے تجربہ گاہ میں روک لیتی ہے اور آئن سٹائن کی معیت میں اسے وجود کی گہرائیوں میں لے جاتی ہے تو وہ روحانی طور پر پوری تعظیم اور احترام کے ساتھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول اکرم ﷺ کے حضور کھڑا ہوتا ہے۔ وہ ایک دن میں بارہا اللہ کے رنگ میں رنگ

Marfat.com

جاتا ہے۔ میرے نزدیک ایسا شخص ہی حقیقی مرشد ہے۔ ذرا غور کیجئے نبی اکرم ﷺ کی بات کو سامعین نے کیوں قبول کیا؟ اُن پر آپ ﷺ کی گفتگو کا اس قدر اثر کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہی تھی کہ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ اپنے زمانے کے مطابق ایسا ہی برتاؤ کیا جیسا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ یقیناً کوئی بھی خدائی حکم کائنات میں جاری قوانین سے متصادم نہیں۔ داعی کی کامیابی کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ وہ اپنے وجود اور روح کی حکمتوں کا ادراک کر کے اپنے دعوتی مضامین کو ان سے ہم آہنگ کر لے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی دعوت وتبلیغ کرتے وقت اپنے زمانے کے حالات اور اپنے مخاطبین کی سطحِ فہم کی رعایت کرتے تھے۔ یہ بات انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سیکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بات میں اس قدر تاثیر تھی کہ تھوڑے ہی عرصے میں ایک جہاں نے ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ ان کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ کے تمام حقیقی وارثین امام غزالی، امامِ ربانی اور مولانا جلال الدین رومی وغیرہ مسالک کے اختلاف کے باوجود دعوت وتبلیغ کے اسی طریقے پر چلتے رہے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کا ادراک کیا، جس کے نتیجے میں ان کی کوششوں کے اثرات آج تک محسوس ہوتے ہیں۔

جب ہمارا دور آیا تو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم نے ان نیک اسلاف کے ناخلف ورثاء کی طرح علم سے اپنا رخ پھیر لیا۔ ہم نے ان آداب کو پس پشت ڈال دیا جو ایک مسلمان کو حقیقی مسلمان بناتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ہم اپنی جہالت کی بھینٹ چڑھ گئے۔

۳۔ قرآن اور دل کا باہمی تعلق

مبلغ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دل اور ضمیر کو قرآن کریم کے مطابق سنوارے اور انہیں قرآن کے ترنم کا ہم نوا بنائے۔ قرآن کریم نے یہ بات درج ذیل آیت مبارکہ میں بڑے خوبصورت انداز میں بیان کی ہے:

"اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ

Marfat.com

شَھِیْدٌ۔" [ق:۳۷]

"جو شخص دل (آگاہ) رکھتا ہے یا دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے اس کے لئے اس میں نصیحت ہے۔"

قرآن کریم وعظ و نصیحت اور ہدایت کی کتاب ہے، لیکن قرآن کریم کے ان اوصاف سے استفادہ کے لئے ضروری ہے کہ دل سے قرآن کی طرف توجہ دی جائے، لہٰذا قرآن کریم کو پورے دھیان سے پڑھنا چاہیے۔ کسی اور طریقے سے قرآن کریم سے مطلوبہ استفادہ کرنا ممکن نہیں۔ جو شخص قرآن کے مطابق اپنے کردار کی تعمیر نہیں کرتا اس کے لئے قرآنِ کریم کے اعجازی پہلو کا ادراک ممکن نہیں۔ وہ اللہ کے کلام اور عام انسانی کلام میں فرق نہیں کر سکتا۔ اس قدر پستی کے شکار انسان سے قرآن کریم پر عمل پیرا ہونے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ شاید اسی لئے ارشادِ خداوندی ﴿ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَارَيْبَ فِيْهِ﴾ کے بعد ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ لایا گیا ہے۔ یعنی پروردگارِ عالم کے کلام میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں، لیکن اس سے کما حقہ استفادہ صرف پرہیزگار لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ پرہیزگار لوگ فطری قانون سے سب سے زیادہ آگاہ ہوتے ہیں۔ غافل آدمی کا دل چونکہ مردہ ہوتا ہے اس لئے وہ پرہیزگار کہلا سکتا ہے اور نہ ہی قرآن کریم سے استفادہ کر سکتا ہے۔ درج ذیل آیت کریمہ سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے:

"...يَنظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَأَوْلٰى لَهُمْ" [محمد: ۲۰]

"تمہاری طرف اس طرح دیکھنے لگیں جس طرح کسی پر موت کی بے ہوشی (طاری) ہو رہی ہو۔ سو ان کے لئے خرابی ہے۔"

جو شخص رسول اللہ ﷺ کی طرف اس طرح دیکھے گویا اس پر موت کی بے ہوشی طاری ہے اسے قرآن کریم اور رسول اکرم ﷺ کے ارشادات کی کیا سمجھ آئے گی...؟ یقیناً کچھ بھی نہیں لیکن جو شخص صدقِ دل سے قرآن کریم پڑھتا ہے، چونکہ اس نے اپنے اور کائنات کے درمیان ایک وحدت پالی ہوتی ہے، اس لئے وہ کائنات میں ہونے والے واقعات کو اپنے دل کی نبض کی طرح محسوس کر لیتا ہے۔ جو لوگ واقعات کی نبض ٹٹولنے کی قدرت نہیں رکھتے وہ دعوت و ارشاد کے سلسلے میں کوئی

Marfat.com

قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتے، کیونکہ اس بات کا قرآن کریم پر مجموعی حیثیت سے غور وفکر کی کیفیت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

اسی بات کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھیں تو کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی داعی کی پہلی لازمی شرط انفس وآفاق میں پھیلی ہوئی تکوینی نشانیوں کی قرآن کریم کی آیات کے ساتھ مطابقت و ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ اُسے اِنہیں دو چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے، لہٰذا جس قدر وہ اس شرط پر پورا اترے گا اسی قدر اسے دعوت وارشاد کے میدان میں کامیابی ہوگی۔ بصورت دیگر اسے اپنا اور سامعین کا وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

مبلغ کا پورا وجود اسلامی صفات کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی تمام عادات واطوار اسلامی صفات کی عکاس ہوتی ہیں۔ آفاقی وانفسی نشانیوں کی تحلیل اور ان کی ترکیب سے نتائج تک رسائی کی صلاحیت اُس کا لازمی خاصہ ہوتا ہے، نیز وہ نرم خوئی، پاکیزگی، شفقت اور نظم وضبط جیسی اُن خوبیوں کے ساتھ بھی متصف ہوتا ہے، جن کے بغیر کوئی شخص حقیقی مؤمن نہیں کہلا سکتا۔

دوسرے الفاظ میں جس طرح کافر کی ہر صفت کافرانہ نہیں ہوتی، اسی طرح مومن کی ہر صفت اسلامی بھی نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ دورِ حاضر میں اطرافِ عالم میں کافروں کی کثیر الجہت کامیابیوں کے پیچھے اسلامی صفات کارفرما ہوں، جبکہ کافرانہ صفات کے ساتھ متصف ہونا ہمارے انحطاط کا سبب ہو۔ مؤمن کو مؤمنانہ صفات کے ساتھ متصف اور ان پر سختی کے ساتھ کاربند ہونا چاہیے، چونکہ مبلغ حضرات عام مؤمنین کے لئے نمونہ اور ان کے پیشوا کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے انہیں خاص طور سے اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے۔ مثلاً مؤمن نرم خو اور پاکیزہ انسان ہوتا ہے۔ وہ شفقت ورحمت کا پیکر ہوتا ہے.... ان صفات کی وجہ سے وہ تمام کائنات کو رحمت واخوت کا گہوارہ خیال کرتا ہے۔ اس کی پوری زندگی منظم ہوتی ہے۔ وہ ہر لحظہ خوشگوار موڈ میں رہتا ہے۔ وہ کبھی فضول خرچی نہیں کرتا۔ وہ ہوٹلوں میں بیٹھ کر وقت برباد نہیں کرتا، کیونکہ اس قسم کی باتیں اسے سیرتِ مطہرہؐ میں نہیں ملتیں۔ گھر سے باہر اس کا ٹھکانہ مساجد، عبادت گاہیں اور دعوت وتبلیغ کے مراکز ہوتے

Marfat.com

ہیں۔ وہ علم ومعرفت کا پیکر ہوتا ہے اور فضول کاموں سے کنارہ کش رہتا ہے۔ وہ ہر کام مکمل منصوبہ بندی سے کرتا ہے۔ وہ علت ومعلول کے تعلق اور چیزوں کی حقیقتوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا کہ دورِ حاضر میں اہل مغرب کو ہر میدان میں اس لئے برتری اور عروج حاصل ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی صفات کو اپنا لیا ہے، جبکہ مسلمانوں نے ان کی تمام بری عادات کو اختیار کر لیا ہے۔ مسلمان جب مسجد جاتا ہے تو ان کی صفات کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے جبکہ اہل مغرب اپنے گرجاؤں میں اسلامی صفات کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں۔ حاصل یہ کہ دورِ حاضر میں فی نفسہ اہل مغرب کو فوقیت حاصل نہیں، بلکہ ان میں موجود اسلامی صفات کو فوقیت حاصل ہے، جبکہ دوسری طرف مسلمان مغلوب نہیں، بلکہ وہ کافرانہ صفات مغلوب ہیں، جنہیں مسلمانوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم کو مضبوطی سے تھام لینے کے سوا ہمارے پاس نجات کا کوئی راستہ نہیں۔

۴۔ جائز ذرائع کا استعمال

داعی دعوت وتبلیغ کے میدان میں جائز ذرائع اور اسالیب کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیتا ہے کیونکہ جائز مقاصد کو جائز ذرائع سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ناجائز وسائل کے ذریعے جائز مقصد تک کبھی بھی رسائی ممکن نہیں، چونکہ ہمارا ہدف حق ہے اور باطل ہمارا دشمن ہے، اس لئے اپنے حق ہدف تک پہنچنے کے لئے ہمیں اپنے دشمن ''باطل'' کو استعمال نہیں کرنا چاہیے، ورنہ ہم خود اپنی ہی ذات کو جھٹلانے اور اپنے کاموں کو برباد کرنے والے ثابت ہوں گے۔ درحقیقت دعوت کا کام جھوٹ کی بنیاد پر قائم نہیں ہوسکتا۔ اگر قائم ہو بھی جائے تو اسے دوام حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے علمبرداروں نے جن کاموں میں اس قسم کے ذرائع استعمال کئے ہیں ان سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی برکت اٹھالی ہے۔ ٹھیک ہے وہ تقریریں کرنے اور نعرے لگوانے کے لئے ہزاروں انسانوں کو سڑکوں اور میدانوں میں جمع کر لیتے ہیں، لیکن اِس ظاہری کثرت کی برکت ایک معمولی سے گھر میں چند لوگوں کے سامنے قول وفعل کے تین سچے مخلص مبلغین کی دعوت وتبلیغ کی برکت کا مقابلہ

Marfat.com

نہیں کر سکتی۔ اِن چند لوگوں میں سے ہر ایک اُن کے ایک ہزار افراد پر بھاری ہے، جبکہ اُن کے ہزار افراد اِن کے ایک فرد کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

تمام انسانیت کے دل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ مخاطب کا ہماری بات کو قبول کرنا اور ہماری گفتگو سے اسے ہدایت کا ملنا سب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔ ہمارا کام صرف لوگوں کی حق بات کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ جھوٹی تعبیریں اور مبالغہ آرائیاں نہ صرف یہ کہ ہمارے مقصد (Cause) کے لئے مفید نہیں بلکہ نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ ہم اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنے فرائض کی انجام دہی کے مکلّف و مامور ہیں۔ ہمیں کسی بھی صورت میں اسلام کی خدمت کے نام پر ناجائز ذرائع کو اختیار نہیں کرنا چاہیے، خاص طور پر جب کہ دورِ حاضر میں ایک ہی دکان میں جھوٹ اور سچ ایک ساتھ فروخت ہو رہے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہمارا کردار، ہماری گفتار اور ہماری ذات سب خالص سچائی کی نمائندگی کرتے ہوں۔

۵- معاوضے کا مطالبہ

داعی اپنے مقدس فریضے کے معاوضے میں کسی سے مادی، معنوی یا روحانی بدلے یا شکریے کا طلبگار نہیں ہوتا۔ معاوضے کا مطالبہ اخلاص کی پاکیزگی کو ختم کر دیتا ہے اور جوں ہی اخلاص اور سچائی میں گدلا پن پیدا ہوتا ہے بات کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔ تبلیغ کے لئے نقصان دہ معاوضہ تو دور کی بات ہے، داعی کو تو دعوت کے فریضے کی ادائیگی کے نتیجے میں حاصل ہونے والے معنوی سرور اور روحانی لذت پر بھی تشویش ہوتی ہے کہ کہیں اس کی وجہ سے اس کے اخلاص میں کمی نہ آ جائے۔ اگر تبلیغ کے کام میں مادی مفادات در آئیں تو اخلاص بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ ایسے کام کو تبلیغ ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی سب سے واضح دلیل انبیائے کرام کا وہ ارشاد مبارک ہے جسے قرآنِ کریم نے نقل کیا ہے:

"وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ."

[الشعراء:۱۰۹]

"اور میں اس کام کا تم سے صلہ نہیں مانگتا۔ میرا صلہ تو خدائے رب العالمین ہی

Marfat.com

پر ہے۔"

درحقیقت انبیائے کرام کی اس گفتگو کے ضمن میں درج ذیل آہ وزاری سنی جاسکتی ہے:

"میں تو تمہاری خاطر درد واضطراب میں کروٹیں لیتا ہوں اور تم ہو کہ مجھے حقیر سمجھتے ہوئے پاگل ومجنون کہتے ہو۔ مجھے لوگوں سے دور کرنے کی کوشش کرتے اور مجھ پر پتھر برساتے ہو۔ میں گھر گھر حق بات پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں، جبکہ تم مجھ پر تمام دروازے بند کرنے کی تگ ودو کرتے ہو۔ تم ہر وسیلے سے میرے لئے مشکلات کھڑی کرنے اور مجھے ایذاء پہنچانے کی کوشش کرتے ہو، حالانکہ میں تم سے دنیا یا آخرت میں کسی قسم کا کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ مجھے بدلہ وہی ذات دے گی جس نے مجھے رسول بنا کر بھیجا اور اس فریضے کی ادائیگی کا کہا ہے۔"

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک تمام انبیائے کرام نے یہی بات کہی ہے۔ انہوں نے اپنے تمام فرائض اسی جذبے کے تحت سرانجام دیئے ہیں۔

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری انطاکیہ (بشرطیکہ وہ شہر واقعی انطاکیہ تھا) آئے تو حکومت وقت نے فوری طور پر انہیں قید کرنے کا فیصلہ کیا، چنانچہ انہیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ جب حبیب نجار (جنہیں سب احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے) کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو وہ ذمہ داران کے پاس دوڑتے ہوئے آئے اور ان سے کہا:

"اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ۔" [یٰسین: ۲۱]

"ایسوں کے پیچھے چلو جو تم سے صلہ نہیں مانگتے اور وہ سیدھے رستے پر ہیں۔"

اس واقعے میں قرآن کریم مبلغ کی دو بنیادی شرطوں بلکہ زیادہ درست الفاظ میں دو بنیادی فرائض کی طرف توجہ مبذول کرارہا ہے:

پہلی شرط یہ ہے کہ مبلغ خود ہدایت یافتہ ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ تبلیغ کا معاوضہ نہ مانگے۔

جو شخص نماز نہ پڑھتا ہو وہ مبلغ یا مرشد نہیں ہوسکتا۔ جو شخص اپنی عبادات کمیوں کوتاہیوں سے

Marfat.com

پاک کر کے کامل طور پر ادا نہیں کرتا اس کی بات سنی جاتی ہے اور نہ ہی اس کی بات کا مخاطبین پر کوئی اثر ہوتا ہے۔ جو شخص اپنا پیٹ سود، رشوت اور حرام روزی سے بھرتا ہے وہ مرشد کیسے بن سکتا ہے؟ ایسے مبلغ اور مرشد حضرات جو عیش پرستی اور فارغ البالی کی زندگی میں منہمک ہیں، وہ خود اپنی آخرت کی درستی کے لئے رہنمائی کے محتاج ہیں۔

جن لوگوں کا معیارِ زندگی لوگوں کی اکثریت کے معیار زندگی سے مختلف ہے وہ رسول اعظم ﷺ اور صحابہ کرام کے نقشِ قدم پر نہیں چل رہے۔ ان کی گفتار و کردار سراسر جھوٹ کا پلندہ ہے۔ آج تک کسی نے جھوٹ کے ذریعے سچائی کو نہیں پایا۔ جو شخص خود ہدایت یافتہ نہ ہو وہ دوسروں کو کبھی ہدایت نہیں دے سکتا۔

داعی ہمیشہ سچائی کا درس دیتا ہے۔ اس کی زندگی و معاشرت میں اور خاص طور پر اس کی پیشانی پر سچائی کے آثار دیکھے جا سکتے ہیں، بلکہ زیادہ مناسب الفاظ میں پائے اور دیکھے جانے چاہئیں۔

قرآن کریم پرہیز گاروں کے لئے سرچشمہ ہدایت ہے، لیکن اس ہدایت کے سرچشمے سے صرف وہی لوگ استفادہ کر سکتے ہیں، جو قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق اپنی پوری زندگی کو ڈھال لیتے ہیں۔ درست ہدایت صرف وہی صراطِ مستقیم ہے جو قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ جس شخص کی زندگی درست راستے پر گامزن نہیں، وہ کبھی ہدایت دریافت نہیں کر سکتا اور اگر ایسا شخص دوسروں کا راہنما بن بیٹھے تو لوگ کیونکر ہدایت پا سکیں گے؟

صحیح مرشد اور مبلغ حضرات انبیائے کرام علیہ السلام کے کام یعنی دعوت و تبلیغ کی انجام دہی کے وقت انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ خاص طور پر آج کل کے دور میں جو لوگ دعوت و تبلیغ کے کام میں مشغول ہیں، انہیں دوسرے لوگوں کی بہ نسبت زیادہ صدق دل سے ایسے مرشدِ کامل کی پیروی کرنی چاہیے، جس نے اپنے دل و دماغ دونوں کو اللہ کے نور سے منور کر لیا ہو۔ آج گمراہ قسم کے لوگ علماء پر

Marfat.com

الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے دین اور علم کو روزی کمانے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ ہمیں اپنے عمل کے ذریعے ایسے لوگوں کے الزامات کو غلط ثابت کرنا چاہیے۔ (۱)

دنیاداروں کے مذکورہ بالا الزام کی عملی تردید ضروری ہے۔ صرف زبانی کلامی تردید کا کوئی فائدہ نہیں۔ روئے زمین پر ہر دور میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسلام کی خدمت کا کام اپنے بعض خاص بندوں سے لیتے رہے ہیں۔ انسانیت کی خاطر ہر طرح کی قربانی پیش کرنے والے یہی لوگ انسانیت کو بتا سکتے ہیں کہ ایک صاف گو داعی کیسا ہوتا ہے؟ خدا کے یہ مخلص بندے خدا کی خوشنودی کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں۔ بعض اوقات تو ان کے ترکے میں ان کی تجہیز و تکفین کے لئے بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ لوگ ایک عظیم دعوت کے عظیم علم بردار ہیں، جن کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔

امت مسلمہ ایسے بہت سے لوگوں کو دیکھ اور سن چکی ہے، جو اسلامی طرز زندگی کے پرزور حمایتی معلوم ہوتے تھے، لیکن امت مسلمہ کو ایسے لوگوں سے ہمیشہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اب یہ امت مزید دھوکا کھانے کی متحمل نہیں۔ اب یہ محض باتوں کی بجائے عملی طور پر اسلامی طرز زندگی کی منتظر ہے اور ہر ایسے شخص کو قبول کرنے کے لئے تیار ہے، جو اپنی گفتار کے مطابق کردار کا حامل اور اپنے مقصد کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے لئے تیار ہو۔ امت مسلمہ کی نظر میں اب جھوٹی شہرت کے حامل بے عمل لوگوں کی کوئی وقعت نہیں۔

ایسے لوگوں پر ہرگز اعتماد اور بھروسہ مت کرو جن کی طرزِ زندگی مکمل طور پر ''سوادِ اعظم'' کے طرزِ زندگی کے مطابق نہ ہو۔ دھوکے باز اور عیار قسم کے لوگوں پر اعتماد کرنا مومن کی فراست کے منافی ہے۔ اپنے آپ کو کسی سے منسوب کرنے سے پہلے اس کی روزمرہ کی زندگی کو اچھی طرح دیکھ بھال لو۔ اگر اس میں تواضع اور استغناء پایا جاتا ہے اور اس کی گفتار و کردار میں تضاد نہیں تو اس کی پیروی کرو اور اس سے منسوب ہو جاؤ۔ میرے نزدیک یہ بالکل فطری سی بات ہے کیونکہ کسی کو پرکھے بغیر

(۱) بدیع الزمان سعید نورسی: مکتوبات، ص:۱۶

Marfat.com

اپنے آپ کو اس سے منسوب کر کے اس کی پیروی شروع کر دینا عقلمندی کی بات نہیں۔ تاریخ اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ لہٰذا صرف ایسے شخص کی پیروی کرنی چاہیے، جو محض گفتار کا غازی ہونے کی بجائے ''محمدی کردار'' کا حامل ہو۔ جو لوگ دھوکا بازی کو مہارت اور فن سمجھتے ہیں، ان کی وجہ سے اسلام کو صرف نقصان ہی پہنچ سکتا ہے۔ ایسے لوگ روحانی اعتبار سے ہم سے دور اور ہم ان سے دور ہیں۔

جو لوگ کسی خاص ادارے سے منسلک ہو کر اس کے زیر بارِ احسان ہو جاتے ہیں، وہ اپنے محسنوں کو حق بات بتانے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہ، لیث بن سعد، امام ثوری، فضیل بن عیاض، ابراہیم بن ادہم جیسی مایہ ناز شخصیات کسی کے زیر بارِ احسان ہونے سے بہت بچتی تھیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی خدمات اور باتیں زمانے کی حدود پھلانگ کر ہم تک پہنچ گئیں اور آج بھی زندہ ہیں۔ آہ! وہ کیسا مبارک زمانہ تھا جس نے بہت بعد والے ادوار کو بھی منور کر دیا اور بیک وقت عظیم لوگوں کی اتنی بڑی جماعت کو اپنے حدود میں سمیٹے رکھا۔

ایک مرتبہ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کو کسی نے غمگین پایا۔ پوچھا: ''کیا ہوا؟'' آپ نے جواب دیا: ''دنیا پرستوں نے ہمیں مالِ تجارت سمجھ لیا ہے۔ ایک شخص جب ہمارے ساتھ رہ کر پڑھ لکھ جاتا ہے تو اسے قاضی، گورنر یا میر منشی بنا دیا جاتا ہے۔''(۱)

سفیان ثوریؒ کے خلیفہ ہارون الرشید کو خط لکھنے کا واقعہ تو آپ سب کو معلوم ہی ہوگا۔ حکام کے ساتھ برتاؤ کے سلسلے میں ہمارے لیے یہی ایک نمونہ کافی ہے۔ جب ہارون الرشید خلافت کے منصب پر جلوہ افروز ہوئے تو اس انتظار میں رہے کہ ان کے سابقہ گہرے دوست سفیان ثوری ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے کب آتے ہیں؟ بلاشبہ یہ ان کا حق بھی تھا، لیکن سفیان ثوری کے ذہن میں اس قسم کا خیال نہیں آیا۔ جب انتظار بہت طویل ہو گیا تو ہارون الرشید نے ان کو خط لکھا، جس

---

(۱) امام غزالی: احیاء علوم الدین، ۱/۸۴

Marfat.com

میں ان سے کچھ ناراضگی کا اظہار بھی کیا۔ خط کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے: ''...اے عبداللہ! آپ کے اور میرے تمام دوست احباب مجھ سے مل کر مجھے مبارک باد پیش کر چکے ہیں۔ میں نے ان پر بیت المال کے دروازے کھول دیئے اور انہیں قیمتی انعامات سے نوازا، جس سے مجھے خوشی ہوئی اور میری آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ آپ نے میرے پاس آنے میں تاخیر کر دی ہے۔ میں انتہائی شدت اشتیاق سے آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اے عبداللہ! ایک مسلمان سے ملاقات کرنے اور اس کے ساتھ تعلق و ربط رکھنے کے فضائل سے تو آپ یقیناً آگاہ ہوں گے...'' جب سفیان ثوری نے خط دیکھا تو کانپ اٹھے اور اس سے دور ہو گئے پھر اپنے ہاتھ کو آستین میں ڈال کر اور اس پر اپنی عباء لپیٹ کر اسے پکڑا اور الٹا کر کے اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص کی طرف پھینک دیا اور کہا: ''تم میں سے کوئی اسے پڑھ کر مجھے سنائے۔ مجھے ایسی چیز کو چھونا پسند نہیں، جسے ایک ظالم شخص کے ہاتھ لگ چکے ہوں۔''

حاضرین میں کسی نے اسے لیا اور کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ اس دوران میں سفیان ثوری کے ہونٹوں پر کبھی حیرت سے مسکراہٹ بھی آجاتی۔ جب خط پڑھا جا چکا تو آپ نے کہا: ''اسے پلٹ کر اس کی پشت پر میری طرف سے ظالم کو خط لکھو۔'' حاضرین میں سے کسی نے عرض کیا: ''اے ابو عبداللہ! خلیفہ وقت کی طرف کسی صاف کاغذ پر خط لکھنا شاید زیادہ مناسب ہو۔'' آپ نے فرمایا: ''نہیں، ظالم کی طرف اُسی کے خط کی پشت پر لکھو۔ اگر تو اس نے اسے حلال کمائی سے حاصل کیا ہے تو اسے اس کا اجر مل جائے گا اور اگر اس نے اسے حرام کمائی سے حاصل کیا ہے تو اس کی وجہ سے جہنم میں جلایا جائے گا اور ظالم کی چھوڑی ہوئی چیز ہمارے دین کو خراب کرنے کے لئے ہمارے پاس نہیں رہے گی۔'' عرض کیا گیا: ''کیا لکھیں؟'' جواب ملا: لکھو! ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یہ خط اللہ کے گنہگار بندے سفیان بن سعید بن منذر ثوری کی طرف سے ایمانی حلاوت سے محروم اور خواہشات کی وجہ سے دھوکے میں مبتلا انسان ہارون الرشید کی طرف ہے۔ اما بعد: ...تم نے اپنے خط میں مسلمانوں کے

Marfat.com

بیت المال کونقصان پہنچانے اوراسے ناجائز جگہوں میں خرچ کرنے کا اعتراف کرکے مجھے اپنے خلاف گواہ بنالیا ہے۔اس لئے اے ہارون! ذرا سنبھل جاؤاور سوال کا جواب اور مصیبت کا حل تلاش کررکھو۔عنقریب تمہیں ایک منصف حاکم کے حضور پیش ہونا ہے...''بقیہ واقعے کو ہارون الرشید کے محل کے حاضرین میں سے ایک شخص یوں بیان کرتا ہے:...''جب خط ہارون الرشید کے پاس پہنچا تو وہ اسے پڑھنے لگے۔ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگےاور رونے کی وجہ سے ان کا سانس گھٹنے لگا...اس کے بعد یہ خط ہمیشہ ہارون الرشید کے پاس رہتا جسے وہ اپنی وفات تک ہر نماز کے بعد پڑھتے۔''(۱)

آپ کے خیال میں سفیان ثوری کی اس طاقت اور شجاعت و بہادری کا سرچشمہ کیا ہو سکتا ہے کہ جس کی بدولت انہوں نے خلیفہ وقت کواس انداز سے مخاطب کیا؟ یہ طاقت دنیا کے متاع وسامان سے بے رغبتی اوراللہ کے سوا ہر چیز سے بے نیازی کا نتیجہ ہے۔اگران کا دل بھی دوسرے لوگوں کی طرح دنیا میں اٹکا ہوا ہوتا تو وہ ایسے اسلوب سے خلیفہ وقت کو ہرگز خطاب نہ کر سکتے۔باوجوداس کے کہ وہ خلیفہ پانچ وقتہ نماز کا پابند تھا۔اس نے بارہا حج اور عمرے کئے۔وہ نفلی روزوں کا بھی اہتمام کرتا تھااور ایک مہربان اور نرم مزاج انسان تھا،لیکن چونکہ اس سے بعض گناہوں کا بھی ارتکاب ہوا تھااس لئے اس کے ایک سابقہ دوست نے مذکورہ بالا اسلوب میں اسے خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔

آنے والی اُن نسلوں کے لئے (جن سے انسانیت کونجات کی امیدیں وابستہ ہیں) میری پہلی اور آخری نصیحت یہ ہے کہ خدا کے لئے معزز اور خوددار بن کر رہے اور طاقت کے مراکز کو اپنے اوپر کنٹرول حاصل کرنے کی دعوت نہ دیجیے۔اگر تمہیں دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں ان کے پاس جانا پڑے تو ہمیشہ مستغنی بن کر رہیے۔حق بات کی دعوت واشاعت کے دوران اپنے آپ کو دوسروں

---

(۱) الغزالی:احیاء علوم الدین،۲/۵۰۷،۵۰۹

Marfat.com

کے زیر بار احسان ہرگز نہ ہونے دیجئے۔ اللہ تعالیٰ کے جاری کردہ اصول وضوابط بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ تم صرف خدا کے سامنے بندگی کا اظہار کرنے کے پابند ہو جاؤ، جس کے نتیجے میں تمہاری بات میں تاثیر پیدا ہوگی اور تمہاری دعوت وتبلیغ کو دوسروں کے دل قبول کریں گے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمہاری گفتگو میں تاثیر پیدا کرنے کی ذمہ داری اٹھا رکھی ہے، بشرطیکہ تم کسی اور سے بدلے کے امیدوار نہ رہو۔ اگر اللہ تعالیٰ دنیا میں تمہاری بات میں تاثیر پیدا کر دیں اور آخرت میں تمہیں اپنے دیدار اور جنت کی دولت سے نوازیں تو تمہیں اور کیا چاہیے؟ لیکن اگر تم نے اس طریقے کے مطابق کام نہ کیا اور لوگوں سے صلے کے امیدوار رہے تو دنیا میں تمہاری بات کی تاثیر تو ختم ہو ہی جائے گی، آخرت کی بڑی بڑی نعمتوں سے بھی محرومی بھی تمہارا مقدر بن جائے گی۔

دنیا کے مناصب اور جاہ وجلال فانی ہیں۔ یہ اس قابل نہیں کہ ان سے جی لگایا اور دھوکا کھایا جائے۔ البتہ دورِ حاضر میں اضطراری حالات کے تحت حکومتی عہدوں پر کام کرنا جائز ہے۔ موجودہ دور میں جس شخص کی آمدنی حکومتی تنخواہ ہو اس کے لئے تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے پیچھے جائداد نہ چھوڑے، کیونکہ حکومتی تنخواہوں میں عام طور سے بہت ساری قباحتیں شامل ہو جاتی ہیں۔ میں نے یہ بات صرف (ترکی کے) موجودہ حالات کے تناظر میں کہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ حالات مکمل طور پر تبدیل ہو جائیں گے اور ہر ایک کو جائز طریقے سے روزی کمانے کے ذرائع میسر آ جائیں گے۔

ہمیں یہ عزم کر لینا چاہیے کہ تبلیغ کی ادائیگی کے لئے ہم نہ صرف دنیوی عہدے اور مناصب چھوڑ دیں گے، بلکہ اگر ضرورت پڑی تو آخرت کے مقامات ومراتب سے بھی دست بردار ہو جائیں گے۔ جس طرح ہم چند لوگوں کو دین کی بات سمجھانے کو پارلیمنٹ کا رکن بننے پر ترجیح دیتے ہیں، اسی طرح ہمیں اسے قطب اور غوث بننے پر بھی ترجیح دینی چاہیے، کیونکہ اصل مقصد تو لوگوں کو نصیحت اور ان کی رہنمائی کرنا ہے۔ کوئی دنیوی یا اخروی مرتبہ اس سے بڑھ کر بلند اور افضل نہیں۔ اس لئے تبلیغ کو دنیوی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانا، مثلاً دعوت وتبلیغ کی وجہ سے حاصل ہونے والی

Marfat.com

شہرت اور نیک نامی کو استعمال کرنا ایسی ہی حماقت ہے جیسے کوئی شخص قیمتی ہیروں کے بدلے بے قیمت کانچ کے چند ٹکڑے لے لے۔

ایک ضعیف روایت میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں ایک ایسے شخص کو خنزیر کی صورت میں مسخ کر دیا گیا، جو دین کو دنیوی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بناتا تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ ہر وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عظمت کے گن گایا کرتا تھا، لیکن چونکہ اس نے اسے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کیا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے ذلیل ترین جانور کی صورت میں مسخ کر دیا۔

بلاشبہ حضور ﷺ کے ساتھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کئے گئے وعدے کی وجہ سے اس امت کو صورتوں کے مسخ ہونے کا عذاب نہیں دیا جائے گا لیکن آخرت میں بہت سے لوگوں کا انجام مذکورہ بالا شخص سے مختلف نہ ہوگا۔

ہم اللہ تعالیٰ کے حضور دست دعا اٹھائے ہوئے التجاء کرتے ہیں کہ ہمیں اور تمام مبلغین ومرشدین کو ایسے انجامِ بد سے محفوظ رکھے۔ بیشک وہ دعائیں سنتا ہے اور انہیں پورا کرنے پر قدرت بھی رکھتا ہے۔

۶۔ مخاطب کے مزاج سے آگاہی اور افہام وتفہیم کے انداز کی اہمیت

۱۔ مخاطب کے مزاج سے آگاہی کی اہمیت

داعی اپنے مخاطبین کے حالات کا نزدیک سے جائزہ لیتا ہے۔ وہ ان کی غلطیوں پر ان کے ساتھ کشادہ دلی کا برتاؤ کرتا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ اس کا برتاؤ مروت پر مبنی ہوتا ہے، جبکہ کافروں اور بے دینوں کے ساتھ دانش مندی اور فراست کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے۔ اس طرح کے اسالیب اختیار کر کے وہ اپنے مخاطبین کے دل میں اپنے لیے جگہ بنالیتا ہے اور اپنی بات کو عمدہ انداز میں پیش کر کے مخاطبین کے لئے قابلِ قبول بنا دیتا ہے۔

داعی مخاطبین کے حالات سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے۔ وہ ہر ایسے اسلوب اور کام سے احتراز کرتا ہے، جس سے اس کے مخاطبین کے متنفر ہونے کا اندیشہ ہو۔ وہ صرف اعلیٰ درجے کی پاکیزہ

Marfat.com

باتوں کی دعوت دیتا ہے۔ یقیناً جو شخص اللہ، اس کے رسول ﷺ اور کتاب اور آخرت کی دعوت دیتا ہے اور انہیں مخاطبین کی نظروں میں خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے، وہ اپنے کام کی اہمیت پہچانتے ہوئے اس کے مطابق اپنے حالات و کردار کی اصلاح کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ ذرا سی ناگواری مخاطب کو اُن باتوں سے متنفر کرنے کا موجب بن سکتی ہے، جنہیں خوشنما بنا کر پیش کرنا داعی کی ذمہ داری تھی۔ کیا اس سے بڑی نقصان کی کوئی اور بات ہو سکتی ہے؟ ہمارے اعمال و کردار کی وجہ سے امت کو پہنچنے والے تمام نقصانات کے آخرت میں ہم جواب دہ ہوں گے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہی آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر بلند آواز سے دعا مانگ رہے تھے۔ یہ کیفیت دعا کے آداب کے منافی تھی، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اسے مخاطب بنا کر اس کی غلطی پر تنبیہ کرنے کی بجائے عمومی انداز میں ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! اپنے آپ کو مشقت میں مبتلا مت کرو۔ تم کسی بہری یا غائب ہستی کو نہیں پکار رہے۔ تم تو ایسی ذات سے مناجات کر رہے ہو جو تمہاری ہر بات سنتی ہے۔ وہ تمہارے قریب ہے اور ہر وقت تمہارے ساتھ ہوتی ہے۔''(۱)

ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر کہنے لگا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ میں صرف فلاں صاحب کے لمبی جماعت کرانے کی وجہ سے فجر کی جماعت چھوڑ دیتا ہوں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ کو شدید غصہ آیا۔ آپ ﷺ اُس امام سے بخوبی واقف تھے، لیکن اس کے باوجود اسے بلا کر اس سے باز پرس کرنے کی بجائے آپ ﷺ نے تمام حاضرین کو خطاب کر کے فرمایا:

''يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ مِنكُمْ مُنَفِّرِينَ فَأَيُّكُمْ مَا صَلَّى بِالنَّاسِ فَلْيُوجِزْ فَإِنَّ فِيهِمُ الْكَبِيرَ وَالضَّعِيفَ وَذَا الْحَاجَةِ''

''اے لوگو! تم میں سے بعض لوگ دوسروں کو اسلام سے متنفر کرنے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ تم میں سے جو بھی دوسروں کو نماز پڑھایا کرے تو مختصر پڑھائے، کیونکہ نمازیوں میں بوڑھے، کمزور اور ضرورت مند ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔''(۲)

یہ تھا دوسروں کی غلطیوں کی اصلاح کا نبوی طریقہ۔ آپ ﷺ لوگوں کو لغزشوں سے بچانے کا اہتمام فرماتے اور ہر بات انتہائی سادہ اور قابل عمل انداز میں پیش کرتے۔

---

(۱) البخاری: المغازی، ۳۸؛ مسلم: الذکر، ۴۴/۴۵؛ المسند: ۴/۴۰۳

(۲) البخاری: الاحکام، ۱۳؛ مسلم: الصلوۃ، ۱۸۲

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"أَيُّهَا النَّاسُ قُولُوا لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ تُفْلِحُوا"

"اے لوگو! لا الہ الا اللہ پڑھ لو کامیاب ہو جاؤ گے۔"(۱)

آپ ﷺ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب کو گناہ گار ہونے کا احساس دلانا بہت بڑی غلطی ہے، بلکہ اپنی بات کسی خاص شخص کو مخاطب بنائے بغیر عمومی انداز میں کہنی چاہیے تاکہ ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس بات سے ایسے ہی استفادہ کرلے جیسے تمام کائنات سورج کی شعاعوں سے استفادہ کرتی ہے۔ بصورتِ دیگر زخموں کا مندمل ہونا بہت دشوار ہو جائے گا۔

ب- بحث و مباحثہ سے احتراز

داعی کو اپنے مکالمے کے جھگڑے اور نزاع میں بدلنے سے بہت ہی احتراز کرنا چاہیے، کیونکہ جھگڑے اور نزاع کی صورت میں "انا پرستی" افہام و تفہیم کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ ایسی فضا میں درست بات تک رسائی ممکن نہیں رہتی اور گفتگو کی لگام شیطان کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے، جس کے نتیجے میں ہم اپنی بات جتنی بھی مؤثر اور مؤدب انداز میں کیوں نہ پیش کریں، اس کا مخاطب پر کوئی اثر ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اسے قبول کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اس مسئلہ پر گفتگو کرنے والوں کے نفسیاتی پہلو سے نظر ڈالیں تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جھگڑے اور نزاع میں کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ ایسی صورت حال میں جس طرح ہم اپنے مدمقابل کو زیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی طرح وہ بھی ہم پر غلبہ پانے کی سرتوڑ کوشش کرتا ہے۔ اپنی بات کے اثبات کے لئے ہم جو دلائل پیش کرتے ہیں، وہ دوسرے دلائل کے ذریعے انہیں غلط ثابت کرنے کے لئے تیار بیٹھا ہوتا ہے۔ اس طرح جھگڑے کے نتیجے میں مکالمہ بے فائدہ گفتگو کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔

ٹھیک ہے! عصر سعادت میں رسول اکرم ﷺ نے بھی دو ایک بار مناظرہ کیا اور اپنے مخاطبین کو قائل کرنے کی کوشش کی(۲) لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ایسی صورت میں

---

(۱) المسند: ۳/۴۹۲، ۴/۶۰۳

(۲) دیکھئے: الترمذی: الدعوات، ۶۹؛ المسند: ۴/۴۴؛ ابن حجر: الاصابة، ۱/۳۳۷؛ ابن ہشام: السیرة، ۱/۳۱۳، ۳۱۸

Marfat.com

مناظرے کا مطالبہ مدِ مقابل کی طرف سے تھا، نیز ایسے مواقع پر بھی حضور ﷺ اپنے سامعین کی روحانی قوت پر اثر انداز ہونے کے لئے اکثر خاموش رہتے تھے، نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ جھگڑے اور نزاع کی غرض سے آنے والے اکثر لوگ پوری طرح قائل نہیں ہوئے، اگرچہ انہیں الزامی جواب دے کر خاموش ہونے پر مجبور کردیا گیا تھا، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس طرح انہیں ہدایت بھی مل گئی تھی۔

رسول اکرم ﷺ کو علمائے بنی اسرائیل سے سالہا سال تک واسطہ رہا، لیکن اس کے باوجود ان میں سے ایک بھی بحث و مباحثہ کے نتیجے میں ایمان نہیں لایا، باوجود اس کے کہ آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پر ہر وقت عرشِ الٰہی سے الہامات کی آبشاریں گرتی تھیں، ساری کائنات آپ ﷺ ہی کے واسطے پیدا کی گئی تھی اور آپ ﷺ کی سیرت معجزات سے بھری پڑی ہے، جس نے بھی بحث و مباحثہ کا اسلوب اختیار کیا وہ ہدایت پانے کی بجائے تمام عمر گفت و شنید کے مرحلے میں ہی رہا۔

حضرت عبداللہ بن سلام (جو پہلے یہودی تھے) کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر آپ ﷺ تورات میں مذکور اوصاف کے مطابق ہوئے تو وہ اسلام قبول کرلیں گے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھنے کے لئے لوگوں کے ہجوم میں آیا۔ جب میں نے رسول اللہ ﷺ کا چہرہ غور سے دیکھا تو مجھے فوراً احساس ہوگیا کہ ایسا چہرہ کسی جھوٹے آدمی کا نہیں ہوسکتا۔(۱)

جدل و نزاع کے دوران خدا کی خوشنودی کا کبھی خیال تک نہیں آتا، کیونکہ ایسی صورت حال میں متکلم اور مخاطب دونوں کشیدگی اور انا پرستی میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں اور جس فضا میں خدا کی خوشنودی مقصود نہ ہو وہاں عمدہ سے عمدہ کلام بھی بے اثر ثابت ہوتا ہے، کیونکہ ہدایت تو صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا جہاں خدا کی خوشنودی مقصود نہ ہو وہاں سے ہدایت کا گزر نہیں ہوتا۔

---

(۱) الترمذی: صفة القيامة، ٤٢؛ ابن ماجه، الاقامة، ١٧٤

Marfat.com

ج- انا پرستی سے اجتناب کی اہمیت

انا پرستی ہدایت کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے، اس کی وجہ سے مبلغ اور مخاطب دونوں ہدایت کی برکات سے محروم رہتے ہیں، اس لئے مرشد اور مبلغ کو اس نقصان دہ احساس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔ اسے اپنی بات تواضع وانکسار سے پیش کرنی چاہیے۔ اس کے نتیجے میں مخاطب بھی عناد اور پہلے سے قائم شدہ رائے سے بلند ہو کر سوچنے پر مجبور ہو جائے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کسی بھی انسان کو انا پرستی کا مظاہرہ کرنے کا حق نہیں۔ اکثر یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ حکمت، استدلال، فصاحت اور بلاغت سے بھرپور گفتگو اور زبان کی روانی کے باوجود مخاطب پر کوئی اثر نہیں ہوتا، جبکہ دوسری طرف اگر داعی کی زبان میں روانی نہ بھی ہو، لیکن اس کا دل صاف ہو تو اس کی گفتگو کے سامعین پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور وہ بہت سے لوگوں کی ہدایت کا باعث بن جاتی ہے۔

د- مخاطب کے فکری پس منظر سے آگاہی

اب میں ایک ایسی بات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، جسے عام طور پر اتنی اہمیت نہیں دی جاتی، لیکن اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

مرشد اور داعی حضرات کو اپنے سامعین کی ذہن سازی کا خصوصیت سے اہتمام کرنا چاہیے۔ ذیل میں اس موضوع پر ذرا گہرائی سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی:

دورِ حاضر میں اسلامی جماعتوں کا وجود ایک حقیقت ہے۔ کسی چیز کے وجود کو تسلیم کرنا اور بات ہے اور اسے درست تسلیم کرنا ایک بالکل مختلف بات ہے۔ بالفعل کسی موجود چیز سے چشم پوشی کرنا یا اسے نظر انداز کرتے ہوئے اس کا انکار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، اس لئے مرشد اور مبلغ حضرات کو ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کے حلقہ اثر یا سامعین میں کسی خاص مسلک یا جماعت سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ انہیں اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے گفتگو کرنی چاہیے۔ انہیں ایسی باتوں سے مکمل طور پر احتراز کرنا چاہیے، جن سے کسی خاص جماعت کی توہین، تردید یا غیبت کا پہلو

Marfat.com

نکلتا ہو۔ ہر مسلک اور جماعت والوں کو چاہیے کہ وہ اپنے مسلک یا جماعت کو حق اور درست سمجھنے کے باوجود دوسروں کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آئیں اور ان کے وجود کے حق کو تسلیم کریں۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کا ایسا طرزِ عمل پسند نہیں جو بے برکتی کا باعث بنے۔ ہر داعی پر تمام اسلامی جماعتوں کا احترام لازم ہے۔ اسے اپنے مخاطبین سے آگاہی ہونی چاہیے، تاکہ اس کی بات تمام جماعتوں کے لئے قابل قبول ہو۔ اللہ تعالیٰ کو لوگوں کے ساتھ بُرا برتاؤ کرنے والے اور مسلمانوں پر تنقید کرتے رہنے والے لوگ پسند نہیں، نیز اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے جو اپنے اہل تعلق کے ساتھ قطع تعلقی کرتے ہوں، اگرچہ وہ تعلق صرف کلمہ توحید ہی کا کیوں نہ ہو۔

داعی کے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ تعلق کو جانچنے کا معیار اس کا اللہ کے لئے لوگوں کے ساتھ تعلق ہے۔ ہمیں اپنے مخاطبین کے ساتھ ویسا ہی تعلق رکھنا چاہیے جیسا کہ ان کا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ تعلق ہے۔ مرشد اور داعی حضرات کو اس بات کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔ انہیں لوگوں کو اپنے مسلک کی طرف بلانے کی بجائے اسلام کی طرف بلانا چاہیے۔ میرے خیال میں یہ طرزِ عمل مختلف مسالک اور جماعتوں کو متحد ہو کر ایک جسم کی مانند بننے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

مخاطب سے آگاہی سے مراد اس کے معاشرتی اور تہذیبی پس منظر سے آگاہی ہے۔ تبلیغ کے حق میں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ جس طرح دعوت وتبلیغ ایک ذمہ داری ہے، اسی طرح دعوت وتبلیغ کے فن کو سیکھنا بھی ایک مستقل ذمہ داری ہے۔ مثلاً اگر آپ توپ وتفنگ سے مسلح دشمن کا مقابلہ ڈنڈے سے کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ ایک ”کام“ تو ضرور ہے، لیکن چونکہ آپ نے تبلیغ کے فن کی رعایت نہیں کی، اس لئے اس کے نتیجے میں آپ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ اسلامی تحریکوں میں اس قسم کا طرزِ عمل اور بھی زیادہ نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم پہلے بھی یہ بات بڑی تاکید سے کہہ چکے ہیں کہ تبلیغ کے فن سے آگاہی تبلیغ کی سب سے پہلی شرط ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جس قدر ہمیں دعوت وتبلیغ کی ضرورت پر یقین ہے، اسی قدر دعوت وتبلیغ کے فن کی ضرورت کا احساس بھی ہونا چاہیے۔ اگر ہماری گفتگو مخاطب کے فہم کی سطح سے بہت زیادہ بلند یا بہت زیادہ پست ہوئی تو یہ طریق کار تبلیغ کے فن کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے مفید ثابت نہ ہوگا۔

Marfat.com

کفر والحاد میں مبتلا شخص کے سامنے قیام اللیل اور تہجد کے فضائل بیان نہیں کرنے چاہئیں، بلکہ اسے اس کی فہم و فراست کے مناسب عملی انداز میں پہلے ایمان کی بنیادی باتیں سمجھانے کی ضرورت ہے، کیونکہ آج کل معاشرے میں کفریہ افکار علم کا لبادہ اوڑھ کر داخل ہوتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ بیچارے بے دین لوگوں کے بارے میں کی جانے والی نہ جانے کتنی غلطیوں کا سرچشمہ غلط تشخیص اور غلط طریقہ علاج ہوتا ہے۔ نئی نسل کے دل کی اصلاح اور اس کے زخموں پر مرہم رکھنے کی بجائے اس کی ظاہری حالت اور لباس پر توجہ دینے کا نتیجہ ہے کہ وہ دین سے متنفر ہو کر دور بھاگتی ہے۔ دعوت و تبلیغ کے میدان میں اس قسم کی غلطیاں، چونکہ انسان کی اخروی زندگی کی بربادی کا باعث بن سکتی ہیں، اس لئے ان پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اگر آپ کا مخاطب سائنس اور فن کے موضوع پر گفتگو کر رہا ہے تو اس کے سامنے قدیم کتب فقہ کی عبارات پڑھنا کوئی دانش مندی کی بات نہیں۔ اس سے کتبِ فقہ کی قدر و قیمت کو کم کرنا ہرگز مقصود نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ ایسا طرزِ عمل اس موقع کے مناسب نہیں۔ اسی طرح اگر مخاطب آخرت کا منکر ہے تو اولیائے کرام کے مناقب سنا کر اسے اپنے قریب نہیں لایا جا سکتا، کیونکہ انسان صرف احساسات و جذبات ہی نہیں رکھتا کہ وہ اس قسم کے مناقب سے متاثر ہو جائے، بلکہ وہ منطقی اندازِ فکر کا بھی مالک ہے، اس لئے اسے منطقی انداز میں قائل کرنا ضروری ہے۔ علامہ سعد الدین تفتازانی ایمان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ایمان ایک ایسی روشنی ہے، جسے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے دل میں چاہتے ہیں ڈال دیتے ہیں۔'' (یعنی اختیاری حصے کو استعمال کرنے کے بعد) خلاصہ یہ کہ ہمارا کام دلائل کے ذریعے ایمان کی وضاحت کرنا ہے۔ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ مخاطب کے دل میں ایمان کی روشنی ڈال دیں گے۔ درحقیقت ایسا ایمان ہی دائمی طور پر نیک اعمال اور دین کے احترام کا باعث بنتا ہے۔ جبکہ احساسات و جذبات کے تحت ایمان کو قبول کرنے والا شخص بعض اوقات ان احساسات و جذبات کے کوئی اور رنگ اختیار کرنے کی صورت میں ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

باوجود اس کے کہ قرآن کریم طبیعیات یا کیمیا کی کتاب نہیں، لیکن وہ سینکڑوں آیات میں

Marfat.com

سائنس وٹیکنالوجی کے مسائل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔قرآن کریم عمومی ہدایت اور ان سائنسی شاخوں کی ضرورت کے پیش نظر اشارات وکنایات میں مسلمانوں کو رہنمائی وترغیب دیتا ہے۔علم فلکیات اور حیاتیات سے بالکل ہی نابلد شخص کے لئے قرآن کریم کی بہت سی آیات کو مطلوبہ حد تک سمجھنا ممکن نہیں، کیونکہ قرآن کریم کی بہت سی آیات کا سمجھنا اِن علوم سے آگاہی پر موقوف ہے۔اسی لئے ہمارے خیال میں دورِ حاضر کے مرشد ومبلغ حضرات کے لئے ہمہ گیر انداز اختیار کرتے ہوئے مختلف عصری علوم سے واقفیت پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔بصورتِ دیگر ان کی مساعی کے اثرات محدود رہیں گے۔

ھ۔ اپنے زمانے کی تہذیب سے آگاہی

مسلمانوں کے موجودہ حالات پر جوان اور بوڑھے سب خون کے آنسو روتے ہیں۔ ہماری یہ بدحالی کسی حد تک دعوت وتبلیغ کا فریضہ سرانجام دینے والوں کی تہذیبی پستی کا نتیجہ ہے۔اپنے زمانے کی تہذیب سے جاہل، اپنے مخاطبین کے فہم کی سطح سے ناواقف اور ان کے ساتھ گفتگو کرنے کے اسلوب سے ناآشنا شخص کے لئے اپنے دور کے لوگوں کو کوئی بات سمجھانا ممکن نہیں، لیکن اس سے کسی کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اگر دعوت کے اسلوب کی معرفت اور عصری علوم سے آشنائی کے بغیر کسی کو کوئی بات سمجھانا نقصان دہ ہے تو اس کا مطلب ہوا کہ ہم سے امر بالمعروف کی ذمہ داری ساقط ہوگئی۔ ہرگز نہیں، بلکہ اگر دعوت وتبلیغ کی خاطر ستاروں پر بھی جانا پڑے تو ستاروں پر جا کر لوگوں تک ان کی ضرورت کی چیزیں پہنچانا سب سے بڑی ذمہ داری ہوگی۔کفار نے علم طبیعیات کے ذریعے ہمیں زیر کیا۔کیمیا کے ذریعے ہمیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا اور علم فلکیات کے ذریعے ہمارے سروں کو جھکا دیا، لیکن اس کے باوجود ہمیں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ نہیں جانا چاہیے، بلکہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی نسلوں کا ہاتھ تھام لیں اور انہیں وسائل کو استعمال کرتے ہوئے انہیں اس ذلت سے نکالیں، ان کے مادی اور روحانی زخموں پر مرہم رکھیں اور انہیں پھر سے ایسی بلندیاں عطا کریں کہ وہ دوبارہ پستیوں میں گر کر دیگر اقوام کے قدموں میں روندھی نہ جائیں۔

Marfat.com

کائنات کی ہر چیز اور واقعے میں زبان اور شاخیں ہوتی ہیں۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس زبان کو سیکھیں اور ان شاخوں کو مضبوطی سے تھام لیں۔ ورنہ وہ تکوینی آیات کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ تکوینی آیات کو سمجھنے سے قاصر افراد و اقوام ذلت و رسوائی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ قرآن کریم بھی اپنی آیات بینات کے ضمن میں ان تکوینی آیات کی وضاحت کرتا ہے، لہٰذا ان تکوینی آیات سے غفلت برتنے والے شخص کو قرآن کریم کی تلاوت کا حق ادا کرنے والا نہیں سمجھا جا سکتا، خواہ وہ ہر روز ایک ختمِ قرآن ہی کیوں نہ کرتا ہو۔ قرآن کریم کے ہر حامی و ناصر کو یہ بات اپنے پلے باندھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو صرف اس لئے نازل فرمایا ہے کہ انسان اس میں غور و فکر کرے۔

جن حقائق کو ہم دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں، وہ چاہے کتنے ہی مبارک اور بلند پایہ کیوں نہ ہوں اگر ہم انہیں عصری تقاضوں، فہم اور اسلوب کے مطابق پیش نہیں کریں گے تو ان کی تاثیر مشکوک رہے گی۔ دین اور قرآن کو پیچیدہ، پراسرار اور عقلی پیمانوں سے غیر آہنگ انداز میں پیش کرنے کا نتیجہ نئی نسل کے ذہنوں کو مزید الجھانے اور کافروں کے کفر کو مزید تقویت دینے کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ ہم گزشتہ کئی سالوں سے اس تکلیف دہ صورت حال کا سامنا کر رہے ہیں۔ اس صورتِ حال پر ہمارا دل خون کے آنسو روتا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا معیار اپنے ابنائے زمانہ کی فکری سطح سے بہت بلند تھا، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے زمانے کے حالات کے مطابق دین کے مسائل بتاتے تھے۔ صحابہ کرامؓ کے پیروکاروں نے بھی یہی طرز عمل اختیار کئے رکھا۔ مثلاً مجدد العصر امام غزالی کے اندازِ تفہیم کو نہ صرف ان کے اپنے دور میں انتہائی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا، بلکہ بعد کے ادوار میں بھی اس کی مقبولیت برقرار رہی۔ امام غزالی کی اس خوبی کا اعتراف کرتے ہوئے مغرب کے دو مفکرین گب اور ارنسٹ رینان (Arnest Renan) لکھتے ہیں: ”ہم نے امام غزالی سے زیادہ اپنے زمانے کی تہذیب سے آگاہ کوئی شخص نہیں دیکھا۔“ اسی طرح دیگر مجددِ دین امام ربانی اور مولانا خالد وغیرہ بھی علم اور تہذیب کے اعتبار سے اپنے زمانے سے بہت آگے کی سوچ رکھتے تھے، لیکن لوگوں تک زمانے کے

Marfat.com

تقاضوں کے مطابق دین کی باتیں پہنچاتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ ان کی باتوں کا مخاطبین کے دلوں پر اثر ہوتا تھا اور لوگ انہیں قبول کرتے تھے۔

و۔ مرشدِ نرم خو

مرشد کو نہ صرف نرم خو ہونا چاہیے، بلکہ مستقل طور پر اپنی نرم مزاجی کو برقرار رکھنا چاہیے، کیونکہ اسے کبھی تو انتہائی پستی میں آ کر گفتگو کرنی پڑتی ہے اور کبھی انتہائی بلندی پر جا کر تبلیغ کا کام سرانجام دینا ہوتا ہے۔اس کے سامعین کا دونوں انتہاؤں کے ساتھ تعلق ہو سکتا ہے، جس کا تقاضا ہے کہ اس کی فکر میں بہت وسعت ہونی چاہیے۔ورنہ وہ حقیقی مرشد کا کردار ادا نہیں کر پائے گا، بلکہ اس کا شمار دعوت و تبلیغ کے راہزنوں میں ہوگا۔ایسے لوگوں کو اپنے منحوس سائے سے امت کو بچاتے ہوئے ایک طرف ہو جانا چاہیے، تاکہ حقیقی راہنما آگے بڑھ کر اس بدقسمت امت کی دست گیری کر سکیں۔

امت کا درد رکھنے والے ایک عظیم دینی راہنما لکھتے ہیں: ''مؤمن کا دل نوجوانوں کی گمراہی کو دیکھ کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔'' مؤمن کا دل بے قرار رہتا ہے۔جس شخص کا دل نئی نسل کے ایمان سے محروم ہونے پر پریشان نہ ہو وہ دعوت و تبلیغ کرنے کا مستحق نہیں۔مرشد تو بہادری سے اپنے زمانے کے تقاضوں کا ادراک کرتا ہے۔وہ دنیا کی رنگینیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے، بلکہ اپنے فریضے کی ادائیگی کے دوران محض خدا کی خوشنودی کی خاطر بعض اوقات تو جنت کی نعمتوں کو بھی بھول جاتا ہے۔خدا کی توفیق کے حصول اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو مطمئن رکھنے کے لئے مرشد کو ایسا ہی طرز عمل اختیار کئے رکھنا چاہیے۔

گزشتہ صفحات میں مرشد کو اپنے مخاطبین کے بارے میں جن امور سے آگاہی ہونی چاہیے ان کا ذکر گزر چکا ہے۔جس طرح مرض کی تشخیص سے پہلے دوائی دینا غلط ہے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑی غلطی مخاطب کی مشکلات کا جائزہ لینے سے پہلے ان کا حل تجویز کرنا ہے۔یہ داعی کی ایک اہم ذمہ داری ہے۔اس حقیقت سے تو ہر مبلغ آگاہ ہوگا کہ ہر بیماری کے لئے ایک ہی دوا نہیں ہوتی بلکہ مختلف امراض کی مختلف ادویہ ہوتی ہیں۔

Marfat.com

میں ایسے بہت سے لوگوں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جن کے نزدیک انسانیت کی نجات صرف معیشت اور بھاری صنعت (Heavy Industry) کی ترقی میں ہے۔ انہیں اکثر اس کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، اگرچہ اس قسم کے نظریات مختلف حلقوں میں اسلام کے نام سے رائج ہیں، لیکن درحقیقت ان کی حیثیت مارکس اور انگریزوں کی اندھی تقلید کے سوا کچھ نہیں۔ ایسے افکار کی بے مائیگی ظاہر ہو چکی ہے۔ ان کے حامیوں کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ وہ اپنی سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکے۔ بھلا اندھی تقلید پر مبنی نظریات بھی انسانیت کو حیاتِ تازہ بخش سکتے ہیں؟ اس قسم کے نظریات کے پیروکاروں سے کوئی مہم جویانہ اقدام کرنے کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ کم از کم میرے لئے ایسی بات کی تصدیق کرنا بہت مشکل ہے۔

خدا کی قسم! اگر تم نے اپنی نسل پر توجہ نہ دی، اس کی روحانی تربیت نہ کی، اس میں نئی روح نہ پھونکی اور اس میں آخرت کا شعور پیدا نہ کیا تو تہذیبی ترقی اور کارخانوں کی کثرت اس کی نشوونما پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالے گی۔

روحانیت سے محروم اور ہاتھ سے نکلتی ہوئی اس نسل کی اُس وقت تک کسی بھی دلفریب و دلکش فکر سے تسکین نہیں ہو سکتی جب تک اس کے روحانی پہلو کو منظم انداز میں پیش نظر نہ رکھا جائے۔ جو لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ قوم کی پریشانیوں کا حل معیشت کے ذریعے ممکن ہے، وہ بے خبری کا شکار ہیں۔

دورِ حاضر میں عالم اسلام عصری تقاضوں کے مطابق گفتگو کرنے سے عاجز ہونے کی وجہ سے اقوامِ عالم کو مخاطب کرنے کے منصب سے محروم ہو چکا ہے۔ اب اس کی حیثیت صرف دوسروں کی باتیں سننے والے کی سی رہ گئی ہے۔ اگر عالم اسلام دوسروں کی باتیں سن کر ان کا درست تجزیہ کرنے کی صلاحیت ہی حاصل کر لیتا تو اس کے بارے میں امید کی جا سکتی تھی کہ ایک نہ ایک دن دوبارہ قیادت کے مرتبے پر فائز ہو کر اقوامِ عالم کو مخاطب کرنے کے قابل ہو جائے گا، لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس میں ایک اچھے سامع کی صفات بھی نہیں پائی جاتیں۔ یہی صورتِ

Marfat.com

حال دعوتی تحریکوں اور اداروں کی ہے۔ان تحریکوں کے راہنماؤں کو بھی اپنے مخاطبین پر اثرانداز ہونے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، حالانکہ ہمارے پاس قرآن کریم ہے، جو ساری دنیا کے عقلاء کو چیلنج اور پوری انسانیت سے خطاب کرتا ہے۔ ہمارے پاس حضور ﷺ کی ابدی سنت ہے، جو قرآن کریم کی بہترین شارح ہے۔ یہ بات کتنی تکلیف دہ ہے کہ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم ان سرچشموں سے کماحقہ استفادہ کیسے کریں؟ چونکہ ہم نے عقل اور دل میں ہم آہنگی پیدا کر کے قرآن فہمی کی کوشش ہی نہیں کی، اس لئے ہم قرآن وسنت کے مخفی خزانوں تک رسائی سے محروم ہیں۔ اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو مسلمانوں کا موجودہ بحران سے نکلنا ممکن نہیں رہے گا۔

دنیا میں مسلسل تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز طور پر وسعت پیدا ہو رہی ہے، لیکن ہماری باتیں تین صدیاں پہلے کے دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ وسعت پذیر دنیا کے معیاروں پر پوری نہیں اترتیں، یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی موجودہ نسلوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ نتیجتاً ان پر ہماری باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ز۔ عصری نقطہ نظر سے سوچنا

دورِ حاضر میں مرشد اور داعی کو چاہیے کہ وہ عصری نقطہ نظر سے مسائل پر سوچے اور بحث کرے۔ اسے مخاطب کی روحانی کیفیت کا علم ہونا چاہیے۔ اسے اس کے ذہن میں زہر کی طرح رچے بسے افکار سے بھی آگاہی ہونی چاہیے۔ اپنی ان معلومات کی روشنی میں اسے اپنے مخاطب سے گفتگو کرنی چاہیے تاکہ اس کی بات کو مقبولیت حاصل ہو اور وہ مخاطب کے دل ودماغ میں اپنی جگہ بنا سکے، لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ قوم کو تو تازہ خون کی ضرورت ہے اور ہم اسے اینٹی بائیوٹیکس پر اینٹی بائیوٹیکس دیئے جا رہے ہیں۔

اب تک ہم نے جن امور پر روشنی ڈالی ہے وہ محض دعوے نہیں، بلکہ قرآن وسنت پر مبنی حقائق ہیں۔ قرآن کریم اپنی پہلی آیت: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ [العلق: ۱] ”(اے محمد) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے (عالم) کو پیدا کیا۔“ میں تخلیق کے ضمن میں

Marfat.com

تکوینی آیات کی طرف توجہ دلا رہا ہوں۔ ابیقور، ڈیمو قرطیس، سقراط اور افلاطون سے لے کر رسول اللہ ﷺ کے دور تک کے تمام فلاسفہ نے تخلیق کو خصوصیت سے اپنا موضوعِ تحقیق بنایا اور اس کا تجزیہ و تحلیل کر کے اس میں مزید وسعت پیدا کی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس دور کے لوگوں کو تخلیق کے بارے میں بعض معلومات حاصل تھیں۔ انہیں پتا تھا کہ انسان کی تخلیق کا آغاز پانی کے ایک قطرے سے ہوتا ہے اور جنین ماں کے رحم میں مختلف حالات سے گزرتا ہے، لیکن قرآن کریم نے اس موضوع پر کہیں زیادہ وسعت سے روشنی ڈالی اور لوگوں کو مخاطب کر کے کہا:

"قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ." [العنکبوت: ۲۰]

"کہہ دو کہ ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلقت کو پہلی دفعہ پیدا کیا۔"

انسانی علم اور فکر ابھی تک یہ نہیں بتا سکا کہ تخلیق کی ابتداء کیسے ہوئی۔ وہ اس بات کی کبھی بھی وضاحت نہیں کر سکتا۔ یہ بات ہمیں صرف قرآن بتا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کئے بغیر اس حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔

قرآن کریم اپنی بات کا آغاز اس حیرت انگیز معمے کی وضاحت سے کرتا ہے اور اپنے قارئین کی نظر ان تکوینی نشانیوں کی طرف مبذول کراتا ہے، جنہیں قدرتِ الٰہیہ اور ارادہ خداوندی نے خوب صورت ہار کی طرح کائنات کی گردن میں سجا رکھا ہے۔ دوسرے الفاظ میں دیکھنے والوں کے لئے انہیں ایک عجیب نمائش کی صورت میں پیش کیا ہے یا یوں کہیے انہیں ہمارے پڑھنے کے لئے ایک کھلی کتاب قرار دیا ہے، اس لئے ہمارے سامنے رونما ہونے والے واقعات کا درست اندازہ لگانے اور انہیں سمجھنے کے لئے ہمارے پاس اس کتاب، نمائش یا ہار کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں۔

جو مرشد اور مبلغ حضرات محض جذبات اور احساسات بھڑکا کر اپنی جماعت کے لوگوں کو سرگرم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ تکوینی قوانین کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کی اس جدوجہد کا کوئی مستقبل نہیں، کیونکہ محض حسنِ ظن پر مبنی اقدامات ٹیڑھے میڑھے اور پیچیدہ ہوتے ہیں، جو کچھ عرصے

Marfat.com

کے بعد ہی انسان کو آدھے راستے میں چھوڑ کرنا کام ثابت ہو جاتے ہیں لیکن اگر مبلغین لوگوں کی عقل اور دل دونوں کو ساتھ لے کر ان کے جذبات کی چنگاری کو بھڑکانے اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق ایک جماعت تیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ رابطہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔ مرورِ زمانہ سے اس میں کمی نہیں آئے گی، بلکہ حوادثِ زمانہ سے اسے تقویت ملے گی اور عزم وارادے میں مزید پختگی پیدا ہوگی۔

یہاں ضمناً میں ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جس کا ہم سب رات دن مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، وہ یہ کہ ملک کے اندر اور باہر بہت سے دیندار لوگوں کی اولاد کفر والحاد کا شکار ہو جاتی ہے جبکہ دوسری طرف بہت سے بے دین لوگوں کی اولاد ایمان کی دولت سے مالا مال ہوتی ہے، بلکہ بعض بے دین گھرانوں کے بچے گھر والوں کے دباؤ سے تنگ آ کر دین کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے گھر سے بھاگ جاتے ہیں۔ میں یہاں اپنے مشاہدات بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، تاہم یہ بات ہمیں تسلیم کرنی چاہیے کہ اس قسم کے واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں اور مستقبل میں بھی ہوتے رہیں گے۔ جو دیندار گھرانے اپنے بچوں کو ان کی عقلی اور روحانی سطح کے مطابق دین کی تعلیم نہیں دیتے ان کے بچوں کے ذہنوں میں شبہات پیدا ہو کر ان کے دین سے انحراف کا سبب بن جاتے ہیں۔ یہ بات بالکل فطری سی ہے کہ ایسے بچے اپنے ذہن میں گردش کرنے والے سوالات کے بارے میں اپنے گھرانے سے باہر کے کسی شخص سے نہیں پوچھتے، کیونکہ ان کی تربیت خاندانی نظام کے تحت دینی ماحول میں ہوئی ہوتی ہے، لیکن گھر کی یہ دینی تربیت ایک حد سے آگے ان کے لئے کارآمد ثابت نہیں ہوتی۔

ایک مرتبہ میں ایک ایسے ہی خاندان کے ہاں مہمان تھا۔ میں خاندان کے سربراہ سے گفتگو کر رہا تھا۔ وہ شخص اتنا دیندار، نرم دل اور سلیم الطبع تھا کہ اس کی طہارت اور پاکیزگی کے سامنے میں اپنے آپ کو ہیچ محسوس کر رہا تھا۔ اتنے میں اس کا بیٹا کمرے میں داخل ہوا جو ایک یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ اس کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ملحد ہے۔ اس احساس نے مجھے منجمد کر دیا اور وہ

Marfat.com

گھر اپنے اوپر گرتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے دل میں اُس پاکیزہ شخص کو مخاطب کر کے کہا: ''اے کاش! تم اتنے پاکیزہ اور متقی نہ بنتے اور اپنے بیٹے کی ملحدانہ تربیت نہ کرتے۔''

اس کے بالمقابل وہ بچہ جو بے دین خاندان میں پروان چڑھتا ہے، اس کے دل میں ان مسائل کے بارے میں پوچھنے کا جذبہ ہوتا ہے جن کو وہ خود حل نہیں کر پاتا، لہٰذا باہر سے جو ہاتھ بھی اس کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے اس کی طرف بڑھتا ہے وہ اسے تھام لیتا ہے، چونکہ اسلام اسے زمانے کے تقاضوں کے مطابق حقائق سے آگاہ کرتا ہے، اس لئے وہ اسلام کو پسند اور اس سے محبت کرتا ہے، جبکہ دوسری طرف دیندار خاندان میں پروان چڑھنے والے بچے کی دینداری تقلید سے آگے نہیں بڑھتی، حالانکہ اسے ایسی صورتِ حال کا سامنا ہوتا ہے، جس میں جہاں تقلیدی ایمان مفید ثابت نہیں ہوتا۔ اب ہم دوبارہ اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔

ح۔ مخاطب کی سطح پر آ کر گفتگو کرنا

مرشد اور مبلغ حضرات کو چاہیے کہ اپنے سامعین کی سطح پر آ کر ان کی عقل کے مطابق ان سے گفتگو کریں۔ ذیل میں اس کی کچھ تفصیل بیان کی جاتی ہے:

مخاطب کی سطح پر آ کر گفتگو کرنا ''خدائی خُلق'' ہے، جبکہ حضور ﷺ نے ہمیں ''خدائی اخلاق'' اپنانے کا حکم فرمایا ہے۔ قرآن کریم مکمل طور پر ایسا خدائی کلام ہے، جو انسانی عقل کی سطح پر آ کر کیا گیا ہے۔ آپ خود ہی بتائیں کہ اگر قرآن کریم ہماری استعداد، عقل اور صلاحیت کے مطابق نازل نہ ہوا ہوتا تو ہماری کیا حالت ہوتی؟

اگر اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں بھی اسی انداز سے گفتگو کرتے جس طرح انہوں نے کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کی تھی تو ہم اس کی گفتگو کو برداشت نہ کر سکتے، نیز اگر قرآن کریم ایسے اسلوب میں نازل ہوتا جسے صرف عبقری لوگ ہی سمجھ پاتے تو ننانوے فیصد لوگ قرآن کریم سے استفادہ کرنے سے محروم رہتے، لیکن صورتِ واقعہ ایسی نہیں، بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے مخاطبین کی سطح کی رعایت کرتے ہوئے اپنے ارادے، عظمت اور ربوبیت کے مناسب کلام فرماتے

Marfat.com

ہیں۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ صرف قرآن کریم ہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کلام نہیں، بلکہ اُس کے کلام کی اُس کی عظمت سے ہم آہنگ بہت سی صورتیں ایسی بھی ہیں، جن کا ہمیں علم نہیں۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ انسان سے اس کے ''احدیت'' کے راز کے فہم وادراک کی سطح کے مطابق گفتگو فرماتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہمارے فہم وادراک کی سطح کی رعایت کی گئی ہے۔ گویا قرآن کریم ہر شخص سے اس کی ذہنی سطح کے مطابق مخاطب ہوتا ہے۔ قرآن کریم پڑھنے والے کی جو بھی ذہنی سطح ہو وہ قرآن کریم کو اسی کے مطابق اپنے آپ سے مخاطب پائے گا۔ گویا قرآن کریم میں کوئی ایسی ذات پوشیدہ ہے، جو اس سے بہت ہی قریب ہے اور اسے قرآن کریم کے اسرار ورموز کی چھوٹی چھوٹی تفاصیل سے آگاہ کر رہی ہے۔

قرآن کریم کا ایسا اسلوب اختیار کرنا بالکل فطری سی بات ہے، کیونکہ قرآن کریم ایسی ذات کا کلام ہے، جس نے انسان کو عدم سے وجود بخشا، اسے عالم جسمانی میں پیدا کیا۔ وہ اس کے دل کی کیفیات سے ہر لحہ باخبر ہے پھر اس نے اس میں عالمِ امر سے روح پھونکی۔ نہ تو روح کو اُس جسم کے بارے میں پوری آگاہی حاصل تھی، جس میں وہ داخل ہو رہی تھی اور نہ ہی جسم کو اُس روح سے مکمل شناسائی تھی، جس پر اُس کی زندگی موقوف تھی، لیکن جس پروردگار نے انہیں پیدا اور پھر جمع کیا تھا وہ ان دونوں سے بخوبی واقف تھا۔ قرآن کریم اسی پروردگار کا کلام ہے۔

اس خدائی کلام کے مضامین لوگوں کے لئے باعث ہدایت، ان کے راہِ راست پر رہنے کے ضامن اور اسلوبِ خطاب کے لحاظ سے انبیاء ومشائخ اور مبلغ حضرات کی دعوت وتبلیغ کا سرچشمہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس میں غور وفکر کر کے اس سے علم وعرفان حاصل کرتے رہتے ہیں۔

یہ امر واقع ہے کہ قرآن کریم بیک وقت مختلف سطح کے لوگوں سے مخاطب ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے پروردگار کا کلام ہے، جس نے انسان کو اپنے مختلف مظاہر کے مطابق پیدا کیا ہے۔ ہزاروں ممتاز علمائے کرام نے اپنی قرآن فہمی کی سطح کے اختلاف کا

Marfat.com

مظاہرہ کیا ہے۔قرآن کریم کے بارے میں ان کے ملاحظات اور افکار کا تنوع ان کے فکری درجات کے اختلاف کا ثبوت ہے۔حتیٰ کہ آخری ادوار میں بھی اس بات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قرآن کا فہم و ادراک ایک ہی سطح کا نہ تھا،لیکن فہم و ادراک کی سطح کا یہ اختلاف قرآن سے استفادے سے ہرگز مانع نہ تھا۔

ذرا غور فرمائیے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد رسالت میں ایک بدوی آتا ہے اور قرآن کریم سن کر مستفید ہوتا ہے۔اسی دوران وہ عظیم شعراء بھی قرآن کریم سے مستفید ہوتے ہیں، جن کے قصیدے خانہ کعبہ کی دیواروں پر معلق ہوتے تھے۔انہیں میں سے ایک شاعر لبید بھی تھا، جس نے قرآن سننے کے بعد کبھی کوئی شعر نہیں کہا۔اس دور کی ایک عظیم شاعرہ حضرت خنساء رضی اللہ عنہا صرف قرآن کریم ہی کی تلاوت کیا کرتیں تھیں۔یہ لوگ قرآن کے مخاطب تھے۔ان کے ذہنوں اور دلوں پر قرآن کریم آبِ حیات بن کر برستا تھا۔ابن سینا، ابن رشد، فارابی، امام غزالی، فخر الدین رازی، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام مالک جیسے ہزاروں عقلائے زمانہ نے قرآن کے مخاطبین بن کر اس کی شاگردی اختیار کی۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اُن عبقری شخصیات سے اُن کی فکری سطح کے مطابق مخاطب ہوتا تھا۔قرآن کریم کا یہ پہلو اس قدر حیران کن ہے کہ جو شخص بھی حضورِ قلب کے ساتھ قرآن کریم کو سنتا ہے وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ صرف وہی اس کا مخاطب ہے۔بہت سے عبقری سائنس دان جنہوں نے حیرت انگیز طور پر وسعت پذیر سائنس و ٹیکنالوجی کے میدانوں میں ممتاز مقام حاصل کیا اپنے اندر پوشیدہ خداداد صلاحیتوں کی نشوونما اور کائنات میں ودیعت خدا کے فطری قوانین کی جستجو میں سب سے زیادہ خدا تعالیٰ کے ازلی کلام قرآن کریم سے متاثر (Inspired) ہوئے۔

مختلف سطح کے ہزاروں اہل علم قرآن کریم کے آبِ حیات سے اپنی پیاس بجھاتے اور اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھتے ہیں۔کیمیا دان کے لئے ممکن ہے کہ وہ قرآن کریم سن کر یوں محسوس

Marfat.com

کرے کہ صرف وہی قرآن کا مخاطب ہے۔ کیا یہ صرف اُسی کے لئے ممکن ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ ماہر طبیعیات، ماہر فلکیات، ماہر حیاتیات، ریاضی دان اور انجینئر ہر ایک قرآن کریم سن کر یہ محسوس کر سکتا ہے کہ قرآن صرف اسی سے خطاب کر رہا ہے۔ زرعی انجینئر سمجھتا ہے کہ قرآن کریم شروع سے آخر تک زراعت کی کتاب ہے۔ ماہر طبیب قرآن کریم کو ایسا نورانی اور خوشگوار مرکزِ صحت سمجھتا ہے، جو اپنی گفتگو، نورانیت اور ہدایت کے ذریعے بیماریوں کے علاج کے لئے نئے افق کھولتا اور کسی بھی تحقیقاتی ادارے سے بہتر علاج پیش کرتا ہے۔ سائنس کے دیگر شعبوں کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے۔ گویا کسی گاؤں میں کاشتکاری کرنے والا کسان اور ایک چھوٹے سے بٹن کو دبا کر آسمانوں کے آفاق کھول سکنے والا سائنس دان دونوں بیک وقت قرآن کے مخاطب ہیں۔

سمندر کی طرح گہرائی کا حامل یہ قرآن ہر انسان کو اس کے حالات کے مناسب نصیحت کا سامان فراہم کرتا ہے۔ قرآن کریم علم کی ہر شاخ سے مختصر انداز میں بحث کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ''سائنسی انسائیکلوپیڈیا'' ہرگز نہیں۔ اس کا واحد ہدف انسان کو دنیا کی پستیوں سے نکال کر ہمیشہ ہمیشہ کی بلندیوں اور رفعتوں تک پہنچانا ہے۔ اس دوران قرآن کریم انسان کو دعوت وتبلیغ کے اصولوں کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ جو مرشد اور مبلغ قرآن کریم کے خطاب کے مختلف رنگوں کا مشاہدہ کرتا اور انہیں اپنی زندگی میں اپناتا ہے وہ یقیناً مخاطب کی حالت اور سطح کو پیش نظر رکھ کر اس سے گفتگو کرے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں یہ کام بہت مشکل ہے تاہم یہی اسلوب مفید اور ناگزیر ہے۔

گفتگو میں شان وشوکت پیدا کرنے کے لئے مبہم، مشکل اور فلسفیانہ اصطلاحات کا استعمال بالکل غلط ہے۔ دعوت وتبلیغ میں بنیادی چیز سامعین کو اپنی بات اچھے طریقے سے سمجھانا ہوتا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ گفتگو حتی الامکان واضح ہو اور اس سے کوئی گنجلک پیدا نہ ہو، لہٰذا ایسے انداز سے گفتگو کرنی چاہیے جسے ہر سطح کے لوگ با آسانی سمجھ سکیں۔

چونکہ دورِ حاضر کے نوجوانوں کو دینی اصطلاحات اور تعبیرات سے اجنبیت محسوس ہوتی ہے، اس لئے اُن کے ساتھ اُن کی اپنی زبان میں گفتگو کرنی چاہیے۔ ہم اِسے بچوں کے ساتھ

Marfat.com

گفتگو کے ساتھ تشبیہ دے سکتے ہیں۔ جس طرح ہم تین سالہ بچے کا ہاتھ پکڑ کر اسی کی طرح چلتے اسی کی طرح باتیں کرتے اور اسی کی طرح ہنستے ہوئے اس کے تمام حالات کی رعایت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی طرح دعوت و تبلیغ کے دوران ہمیں اپنے مخاطبین کی سطح کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ بچوں کے ساتھ بھاری بھرکم الفاظ والی گفتگو ان کی معلومات میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کرتی، بلکہ صرف انہیں ہنسانے کا فائدہ دے سکتی ہے۔

اپنی موجودہ نسلوں کو اسلام کی تفہیم کے لئے ہمیں ہنری برگساں (Henri Bergson)، بلیز پاسکل (Blaise Pascal)، افلاطون اور رینے ڈیکارٹ (Rene Descartes) کے فلسفیانہ اسلوب کی بجائے رسول اللہ ﷺ کی دعوت و تبلیغ کے انداز کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ آپ ﷺ ہمیشہ دوسروں کے ساتھ ان کے فہم کی سطح کے مطابق گفتگو فرماتے تھے۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ آپ ﷺ کی گفتگو سمجھ سکتا تھا۔ آپ ﷺ بچوں کے ساتھ بچوں کے انداز میں، نوجوانوں کے ساتھ نوجوانوں کے انداز میں اور بوڑھوں کے ساتھ بوڑھوں کے انداز میں گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ یہی اسلوب اور خدائی اخلاق انبیائے کرام کا اسلوب اور اخلاق تھے۔ سید الانبیاء ﷺ سے مروی ہے:

"اِنَّا مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ أُمِرْنَا أَنْ نُكَلِّمَ النَّاسَ عَلَى قَدْرِ عُقُولِهِمْ"

"ہم انبیاء کو حکم ہے کہ ہم لوگوں سے ان کے ذہنی سطح کے مطابق گفتگو کریں۔"(۱)

ایک اور حدیث مبارک میں ہے: "لوگوں سے ان کے مرتبے کے مطابق برتاؤ کرو۔"(۲)

ان احادیث مبارکہ میں دعوت و تبلیغ کا ایک ایسا جلیل القدر ضابطہ بیان کیا گیا ہے، جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

(۱) العجلونی: کشف الخفاء، ۱/۲۲۵-۲۲۶

(۲) (۱) ابو داؤد: الادب، ۲۰؛ مسلم: بدایات المقدمة

Marfat.com

۷۔ ایمان، تبلیغ اور عمل کے نقطہ نظر سے

ا۔ تبلیغ اور زندگی

تبلیغ کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول یہ ہے کہ مبلغ جن باتوں کی دعوت دیتا ہے، انہیں اپنی زندگی میں بھی اپناتا ہے اور جن اصولوں کے مطابق خود زندگی بسر کرتا ہے، انہیں کی دوسروں کو دعوت دیتا ہے۔ مبلغ مثالی مؤمن ہوتا ہے، لیکن مثالی مؤمن وہی شخص کہلا سکتا ہے، جس کے ظاہر اور باطن میں ہم آہنگی پائی جاتی ہو۔ مؤمن کے ظاہر اور باطن میں تضاد نہیں ہوتا۔ دورنگی نفاق کی علامت ہے۔ سچا مبلغ اس قسم کے مذموم اخلاق سے پاک ہوتا ہے۔ اس قسم کے اخلاق اسے زیب نہیں دیتے۔ اس کا ایمان اسے بلند اخلاق کے مطابق زندگی گزارنا سکھاتا ہے۔

مبلغ کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جو نصیحتیں اور ہدایات عملی زندگی میں نہیں اپنائی جاتیں ان کا دوسروں کے ذہنوں پر کوئی مثبت اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاص سے خالی کیفیات اور باتوں میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے برکت شامل نہیں ہوتی۔ باقی ہم بعض اوقات جو غیر مخلص یا نام نہاد مخلص لوگوں کے کاموں کو کامیاب ہوتا دیکھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرے میں ان کا کوئی متبادل موجود نہیں ہوتا، نیز یہ کامیابی وقتی ہوتی ہے، اسے دوام حاصل نہیں ہوتا یا اس قسم کی کامیابی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُس وقت ان لوگوں سے زیادہ مخلص لوگ میدان میں موجود نہیں ہوتے یا مخلص اور سچے لوگ اپنے کام میں مطلوبہ جاذبیت پیدا نہیں کر پاتے، یہی وجہ ہے کہ جوں ہی کوئی بہتر متبادل معاشرے میں آتا ہے، غیر مخلص لوگوں کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ خدائی قانون ازل سے آج تک جاری وساری ہے، اس لئے مؤمنین اور اہل فراست کو غیر مخلص یا نام نہاد مخلص لوگوں کی جزوی یا وقتی کامیابی سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔

جزوی کامیابی کی مثال ہم اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کی کامیابی سے دے سکتے ہیں۔ یہ دونوں نظام ایک ہی وقت میں وجود میں آئے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر میدان میں آیا۔ اس دور میں ان سے بہتر اور ان سے زیادہ اخلاص پر مبنی نظام کی عدم موجودگی کی

Marfat.com

وجہ سے یہ نظام پھلے پھولے اور پھیلے، لیکن اب ایسے لگتا ہے کہ مخلص اور بے دار مغز لوگ واقعات سے سبق لینے لگے ہیں، لہٰذا اب دنیا کے بازار میں صرف مخلص لوگوں کا سامان ہی بکے گا اور صرف انہیں کو خریدار ملیں گے۔ اب خدائی بازار سے غیر مخلص لوگوں کو نکال باہر کرنے کا وقت آ گیا ہےچنانچہ روز اول سے زوال کی شکار اشتراکیت کو تو حقیقت و اخلاص کی منڈی سے دیس نکالا دے کر کوڑا کرکٹ کی طرح ایک طرف کر دیا گیا ہے۔ مستقبل پر نظر رکھنے والوں کو صاف نظر آ رہا ہے کہ اب اہل اسلام کی دعوت کے واحد متبادل کے طور پر میدان میں اترنے کا وقت آ گیا ہے۔

مبلغ جن اصولوں کے مطابق خود زندگی گزراتا ہے، ان کی تبلیغ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب مبلغ مستقل طور پر اپنے نفس کا محاسبہ اور نگرانی کرتا رہے۔ جو شخص صرف پیٹ کے لئے جیتا ہے اور اس کے جسم و روح میں ہم آہنگی کا فقدان ہے، وہ دوغلے پن سے نجات نہیں پا سکتا۔ اس قسم کے لوگوں کے حالات اُن کی حقیقت کے عکاس نہیں ہوتے۔ ان کی حقیقت ویسی نہیں ہوتی جیسی اُن کے عمل اور کردار سے ظاہر ہوتی ہے۔ معاشرے میں وہ جس احترام، پختگی اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہ محض تکلف اور ٹیپ ٹاپ ہوتی ہے۔

یہ لوگ خلوت میں لا پروا اور غیر سنجیدہ ہو جاتے ہیں، جو ان کی ناپختگی اور نااہلیت کی دلیل ہے۔ ان کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے یقین محکم، مکمل اعتماد اور سنجیدہ اطاعت کی ضرورت ہے۔

مبلغ اس معاملے میں بڑا محتاط ہوتا ہے۔ وہ خلوت اور جلوت میں ایک جیسا رہتا ہے۔ وہ اپنے ظاہری اور باطنی حالات، اعمال اور کردار کو خالص اور کھرا رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، تاکہ اس کے انفرادی اور اجتماعی اعمال میں تضاد پیدا نہ ہو۔ مبلغ کی رات بھی اس کے دن کی طرح روشن ہوتی ہے اور اس کا دن خورشید کی طرح تابناک ہوتا ہے۔ اگر کسی عارضی غفلت کے سبب اس سے کوئی چھوٹی موٹی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو وہ فوراً اپنے نفس کی طرف متوجہ ہو کر اس کا انتہائی سخت محاسبہ کرتا ہے۔ اگر اس کی نمازِ تہجد فوت ہو جائے یا اس کی رات غفلت میں گزر جائے تو وہ دن کو نماز کا ذکر کرنے سے بھی شرماتا ہے۔ بدنظری کی وجہ سے آنکھوں کو لگ جانے والی

Marfat.com

غلاظت کو آنسوؤں کے پانی سے دھوتا ہے۔ حرام یا مشتبہ لقمہ اس کے حلق سے نیچے نہیں اترتا اور اگر اتر جائے تو پیٹ میں درد کا باعث بن جاتا ہے۔ معمولی سا روحانی انحراف بھی اسے اپنے لئے وبال جان محسوس ہوتا ہے۔

جو فکر، صاحب افکار کی عملی زندگی پر منطبق نہ ہوں، وہ چاہے کتنے ہی پرکشش اور زندگی کے لئے ضروری کیوں نہ ہوں لوگوں کے ہاں مطلوبہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکتے، کیونکہ ایسے افکار صاحبِ فکر کی دل کی گہرائیوں سے نہیں نکلتے۔ جو افکار خود صاحبِ فکر کے دل و جان میں جاگزیں نہ ہوں کسی اور سے انہیں قبول کرنے کی توقع رکھنا بالکل فضول ہے۔

ب۔ تبلیغ ایک معیار

اسلامی معاشرے میں دعوت و تبلیغ کا کام صرف ایک ذمہ داری ہی نہیں، بلکہ ہر چیز کے لئے معیار اور کسوٹی کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اسلامی معاشرے کے افراد اپنے تمام امور کو اس معیار پر پرکھتے، اس کے مطابق اپنے اوقات کو ترتیب دیتے اور اس ذمہ داری کی خاطر آہ و زاری میں اپنی راتیں گزارتے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں اچھائی کا معیار مسجدوں میں حاضری، فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد واپسی یا میلاد کی محفلوں میں شرکت کرنا نہیں ہوتا۔ ایک اچھا مبلغ ہر ایسی بات سے اجتناب کرنے کی کوشش کرتا ہے، جس سے اس کی دعوت کے رسم و رواج اور ظاہر داری میں تبدیل ہو کر اپنی اصل روح (Spirit) سے محروم ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو اس قسم کی باتوں میں سکون ملتا ہو، لیکن انہیں معاشرے میں اچھائی اور برائی کا معیار ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ درحقیقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو پورے احساس اور منصوبہ بندی کے ساتھ سرانجام نہ دینا معاشرے کے زوال اور انحطاط کا شکار ہونے اور اس کی مادی اور روحانی قوتوں کے بانجھ ہو جانے کا ایک اہم ترین سبب ہے۔

ہمیں یقین کر لینا چاہیے کہ آج اس مہتم بالشان فریضے کی ادائیگی معاشرے کے ہر ہر فرد کی گردن پر فطرت کی طرف سے قرض ہے۔ اگر اس فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی برتی گئی تو فتنوں

Marfat.com

اور انسانی خطاؤں کے سیلاب کے ریلے میں پہلے افراد اور پھر پورے کا پورا معاشرہ بہہ جائے گا۔

میں ایک بار پھر تاکید کے ساتھ یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ دعوت کا بنیادی طور پر ایمان کے ساتھ تعلق ہے۔ آج تک دین کی نصرت وحمایت اور اس فریضے کی ادائیگی قوی الایمان لوگوں نے ہی کی ہے۔ آج بھی یہی صورتِ حال ہے اور آئندہ بھی ایسے ہی رہے گی۔ جب بھی کسی بڑے معاشرے میں چند قوی الایمان لوگوں پر مشتمل جماعت دعوت وتبلیغ کے کام کو لے کر اٹھتی ہے تو اللہ تعالیٰ تھوڑے ہی عرصے میں بہت سے لوگوں کی کایا پلٹ دیتے ہیں۔ ایسی تحریک کی سب سے اہم خصوصیت رسم ورواج اور ظاہر داری سے دور ہونا ہوتا ہے۔

جس تحریک کو مشکلات اور سختیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، وہ عام طور پر رسم ورواج اور ظاہر داری کا شکار ہو جاتی ہے۔ درحقیقت جو تحریکیں رسم ورواج اور ظاہر داری کی بنیاد پر اٹھتی ہیں، ان کے ارکان کے دلوں میں قید وبند، آہ وزاری اور فکری مشکلات کے خیال کا کبھی گزر ہی نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اخلاص اور محبت کے جذبات سے محروم رہتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مرشد اپنی تمام حرکات وسکنات اور طرز زندگی کو اپنے دعوتی مشن کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔ اگر وہ کہیں جاتا ہے تو دعوت ہی کی سوچ لے کر جاتا ہے۔ غرض وہ اپنی ہر حرکت و سکون اور نشست و برخاست کے دوران دعوت وتبلیغ کے بارے میں متفکر رہتا ہے۔ اس کی زندگی میں کسی خاص تفریح کی گنجائش نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنی فطری ضروریات کو بھی اپنی عظیم دعوت کے مطابق ڈھالتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بے شمار ذمہ داریوں میں گھرا ہوا پاتا ہے اور اسے اس بات کا احساس رہتا ہے کہ ایک دن اس سے اس کی ذمہ داریوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی۔ یہ انبیائے کرام، صدیقین، اولیائے عظام اور شہداء کا طرزِ زندگی ہے۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کی دوسروں کو دعوت دی اور جس بات کی دعوت دی اس کے مطابق خود بھی زندگی گزاری۔ بخلاف منافقین کے کہ وہ جو کام خود نہیں کرتے اس کی دوسروں کو دعوت دیتے ہیں اور جن باتوں کی دوسروں کو دعوت دیتے ہیں خود اُن کے مطابق زندگی نہیں گزارتے۔ وہ ہمیشہ غلط راہوں پر بھٹکتے رہتے ہیں۔ خود بھی گمراہی کا شکار ہوتے

Marfat.com

ہیں اور اپنے پیروکاروں کو بھی گمراہی کی طرف دھکیلتے ہیں۔ خود بھی تباہ و برباد ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی تباہ و برباد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک بار فرمایا تھا: ''پہلے اپنے آپ کو نصیحت کرو۔ جب خود نصیحت حاصل کرلو تو دوسروں کو نصیحت کرو۔ خود نصیحت حاصل کئے بغیر دوسروں کو نصیحت کرنے سے تمہیں شرم آنی چاہیے۔''(۱)

درحقیقت اس گفتگو میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی ہونے کی حیثیت سے مخاطب نہیں، بلکہ داعی الی اللہ کی حیثیت سے آپ سے خطاب کیا گیا ہے، لہٰذا اس میں نبی کے ساتھ ساتھ دعوت وتبلیغ سے منسلک ہر شخص کو کہا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بات میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے جس بات کی دعوت دوسروں کو دے شعوری طور پر اسے اپنی عملی زندگی میں بھی اپنائے۔ قرآن کریم اسی بات پر درج ذیل طریقے سے روشنی ڈالتا ہے:

" اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. " [البقرة:٤٤]

''(یہ) کیا (عقل کی بات ہے کہ) تم لوگوں کو نیکی کرنے کو کہتے ہو اور اپنے تئیں فراموش کئے دیتے ہو حالانکہ تم کتاب (خدا) بھی پڑھتے ہو۔ کیا تم سمجھتے نہیں؟''

چنانچہ قرآن کریم میں پہلے اپنی اصلاح پر زور دیا گیا ہے اور ایسے مسلمانوں پر حیرت کا اظہار کیا گیا ہے، جو قرآنی آیات کی تلاوت کرنے کے باوجود اِس بات کو نہیں سمجھ پاتے۔

اس آیت مبارکہ میں واضح طور پر قول وفعل کے تضاد پر بنی اسرائیل کی توبیخ اور مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے۔ داعی کا اپنی گفتار کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنا نفاق کی علامت ہے۔ جو لوگ اس قسم کا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں نہ صرف یہ کہ ان کی گفتگو کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے، بلکہ امت کا ان پر سے اعتماد بھی اٹھ جاتا ہے۔ امت مسلمہ کے دورِ زوال کی تاریخ میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

(۱) الرسالة القشيرية:٢١٦؛ الغزالي: الاحياء، ٧٨/١

Marfat.com

اسلام کے فکری پہلوؤں کو اجاگر کرنے والے بہت لوگ ہیں، جو نہ صرف اسلام کی علمی انداز میں توضیح کرتے ہیں، بلکہ بعض اوقات نئے افکار بھی پیش کرتے ہیں، لیکن چونکہ وہ خود اپنے افکار کے مطابق زندگی نہیں گزارتے، ان کا کردار درست نہیں ہوتا اور ان کی گفتگو ان کے ایمان کی گہرائیوں سے نہیں پھوٹتی، اس لئے وہ کچھ ہی عرصے کے بعد ماضی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ وہ لوگوں کے سامنے ''صراطِ مستقیم'' کی وضاحت کرتے اور بزعم خود ان کی راہنمائی کرتے ہیں، لیکن جوں ہی انہیں تھوڑی سی بادِ مخالف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور اپنے مشن کو چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ لوگوں کو جن باتوں کی نصیحت کیا کرتے تھے خود انہیں بھول جاتے ہیں۔ خود اپنے ہی افکار کی نفی کرتے ہیں اور مخالف حلقوں میں شامل ہو کر ان کی تائید کرنے لگتے ہیں اور آخر کار ناکام ہو کر بے نام و نشان ہو جاتے ہیں، لیکن افسوس! جاتے جاتے ان کے ہاتھوں ایک مکمل تہذیب کا چہرہ بھی مسخ ہو جاتا ہے۔

ج۔ تبلیغ اور مشکلات

یہ قانون الٰہی ہے کہ دعوت و تبلیغ میں ہمیشہ تکالیف و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ جو چیز مشکل سے حاصل ہوتی ہے اس کی قدر اور حفاظت کی جاتی ہے، جب کہ بغیر محنت کے حاصل ہونے والی دولت کو چند منٹوں میں اڑا دیا جاتا ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ کی معرفت سے لوگوں کے دلوں کو منور کرنا انسان کی تخلیق کا اہم ترین مقصد اور اس کی بقا کا ضامن ہے، اس لئے یہ اور بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اسے پسِ پشت ڈالنا روئے زمین پر انسان کے وجود کو بے مقصد بنانے کے مترادف ہے، لہٰذا اپنے وجود کو با مقصد اور فائدہ مند بنانے کے لئے انسان اس عالی المرتبت ذمہ داری کو نبھانے پر مجبور ہے۔

کل بعض لوگوں کو ایک جیل خانے سے دوسرے جیل خانے میں منتقل کیا گیا۔ پورے ملک کے جیل خانے ان کے لئے گھر کی طرح بن گئے ہیں۔ انہیں ہر طرح کی تکلیفیں سہنی پڑیں اور اہانت و تحقیر کی ہر صورت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے بعض لوگوں کو تفتیش کے لئے گھروں سے لایا گیا تھا۔

Marfat.com

اس کے بعد انہیں گھر واپس جانا نصیب نہ ہوا، بلکہ بہت سے لوگ صبح کے وقت اپنے گھر والوں کو ایسی حالت میں الوداع کہتے ہیں کہ ان کے دل میں واپسی کی کوئی امید نہیں ہوتی۔ یہ تمام لوگ جدوجہد کو جاری رکھنے کے لئے یہ تمام صعوبتیں برداشت کرتے ہیں، لیکن جلد ہی اللہ کی رحمت ان لوگوں کی آہ و بکاہ کی وجہ سے جوش میں آتی ہے اور ان کی پاکیزہ اور انتھک کوششوں کے اچھے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں، جن سے بفضلہٖ تعالیٰ ہم سب مستفیض ہو رہے ہیں۔

کسی بھی شخص کو ان مقدس کوششوں کو سبوتاژ کرنے کا حق حاصل نہیں۔ عنقریب ایک متعین سطح تک پہنچ جانے والی اس خدمت پر یقین رکھنے والے حضرات اٹھیں گے اور مشقتیں جھیلنے والے لوگوں کے احساسات اور جذبات لے کر اس تحریک میں شامل ہو جائیں گے۔

ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ دعوت ایک ایمانی مشن ہے۔ ایمان کے حامی و ناصر کو ایمانی زندگی کی بقا کی خاطر سنجیدگی کے ساتھ پرعزم رہنا چاہیے اور اس کا حوصلہ کم از کم اتنا بلند ضرور ہونا چاہیے، جتنی بلند حوصلگی کا مظاہرہ وہ اپنے گھر بار کا نظام چلانے کے لئے کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسے اپنی دعوت کا ایسے ہی دفاع کرنا چاہیے جیسے وہ اپنے گھر بار کا دفاع کرتا ہے۔ بصورت دیگر بنی اسرائیل کے سے انجام سے بچنا ممکن نہیں۔

مبلغ اور مرشد مصائب و مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا ہے اور ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس کے لئے آمادہ کرتا رہتا ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ جب تک اسے وہ مشکلات پیش نہیں آئیں گی، جو اس سے پہلے لوگوں کو دعوت و تبلیغ کی خاطر پیش آئیں، اس وقت تک کامیابی اس کے قدم نہیں چومے گی۔ غرض وہ ہمیشہ پرعزم اور مشکلات برداشت کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اگر اسے مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تو اس پر خدا کا شکر بجالاتے ہوئے اپنے دعوتی کام کو جاری رکھتا ہے۔

مسلمان مخلص اور کھرا انسان ہوتا ہے۔ جو کہتا ہے وہ کر کے دکھاتا ہے اور جو کرتا ہے وہی کہتا ہے۔ قرآن کریم کے مطابق اس کی ضد جھوٹا اور منافق شخص ہوتا ہے۔ جو شخص دین، ایمان

Marfat.com

اور قرآن کی دعوت دیتا اور اسلام کی وضاحت کرتا ہے اس کی زندگی اس کی دعوت کے مطابق ہونی چاہیے۔ ایسے شخص کی زندگی میں گناہ کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے یا کم از کم گناہ اس کے لئے پریشانی و بے قراری کا باعث ہونا چاہیے۔ اگر اس سے کبھی گناہ سرزد ہو جائے تو ساری زندگی اسے اس پر دکھ رہنا چاہیے، اس کی روح کو کبھی بھی گناہ میں ملوث نہیں ہونا چاہیے، مومن کبھی بدنظری کا ارتکاب نہیں کرتا اور نہ ہی حرام چیز کی طرف کبھی ہاتھ بڑھاتا ہے، وہ حرام جگہوں پر جانے سے بچتا ہے۔ اس کی رات دن کی طرح روشن ہوتی ہے، اس کی جائے نماز اس کی سحر گاہی کے سجدوں کے لئے بے تاب رہتی ہے۔ اس کی نمازِ صبح کبھی فوت نہیں ہوتی اور اگر بلاارادہ کبھی ایسا ہو جائے تو اس کا سارا دن آہ وزاری میں گزرتا ہے اور شرم کے مارے وہ پانی پانی ہو جاتا ہے۔

د۔ تبلیغ اور منافقت

مراقبے اور محاسبے کا احساس داعی کو ہمیشہ سرگرم رکھتا ہے۔ مرشد ہمیشہ مراقبے کی کیفیت میں رہتا ہے۔ وہ اپنے جذبات اور خیالات کا بھی محاسبہ کرتا رہتا ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ جن باتوں کی وہ دوسروں کو دعوت دے رہا ہے وہ پہلے خود اس کے رگ و پے میں رچ بس جائیں۔ جن باتوں پر اُس نے ابھی تک اپنا محاسبہ نہیں کیا ہوتا ان کی دوسروں کو تبلیغ کرنے سے بھی اجتناب کرتا ہے، لیکن یہ اجتناب اُس کے دعوتی مشن میں رکاوٹ نہیں بنتا، بلکہ اس میں مزید لگن پیدا کرتا ہے۔ منافقت یا منافقین کے ساتھ مشابہت کے خوف کے باعث وہ اپنے اندر زیادہ سے زیادہ اخلاص پیدا کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔

ایک حدیث میں رسول اکرم ﷺ نے صرف الفاظ کی حد تک دعوت و تبلیغ کرنے والے لوگوں کے بارے میں بڑی سخت وعید ارشاد فرمائی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

"إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَى أُمَّتِي كُلُّ مُنَافِقٍ عَلِيمِ اللِّسَانِ"

"مجھے اپنی امت کے بارے میں سب سے زیادہ خطرہ چرب زبان منافق سے ہے۔"(۱)

---

(۱) المسند: ۱/۴۴

Marfat.com

کوئی شخص ایسا نہ ہوگا کہ اس حدیث مبارک کو سننے کے بعد خوف کے مارے اس کے رونگھٹے نہ کھڑے ہوگئے ہوں۔ ہر طبقے کے لوگوں کو اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔اس قسم کی احادیث دعوت وتبلیغ کے کام کو زوال کا شکار ہونے سے بچا سکتی ہیں۔اس مسئلے کی نزاکت کے باوجود گمراہی پھیلانے والوں کا سلسلہ جاری ہے۔اس قسم کے لوگ ٹیلی ویژن کی اسکرین پر دین، ایمان اور قرآن وغیرہ کے موضوعات پر مفصل تقریریں کرتے اور اخبارات و جرائد میں لمبے چوڑے مضامین لکھتے ہیں، لیکن ان کی پیشانیاں سجدوں کی نورانیت سے محروم اور دل صدق واخلاص سے خالی ہوتے ہیں۔ان بیچاروں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ننانوے فیصد دین کا تعلق تو خود فرد سے ہے۔ان امور کو نظر انداز کر دینے کے بعد انسان کی ساری باتوں کی حیثیت فضول، ہذیان، جدل اور عناد سے زیادہ کچھ نہیں رہتی۔

"قرآن کریم داعی کے بنیادی اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے منافقین کی خصوصیات کو نظر انداز نہیں کرتا، کیونکہ جن امور سے مرشد وداعی کو اجتناب کرنا چاہیے انہیں بیان کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے، جتنا ان امور کو بیان کرنا جنہیں مرشد وداعی کو اختیار کرنا چاہیے۔قرآن کریم منافقین کے اوصاف کا تذکرہ ایسے اسلوب میں کرتا ہے کہ مومنین کو از خود ان سے نفرت پیدا ہونے لگتی ہے۔"

قرآن کریم اس موضوع پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالتا ہے حتی کہ منافقین کے دلوں کے خیالات، ان کی اندرونی کیفیات اور ان کی نیتوں سے بھی پردہ اٹھا کر منظر عام پر لے آتا ہے، بلکہ بعض اوقات تو ان کے قد وقامت اور مزاج کا بھی تذکرہ کرتا ہے۔ذرا اس آیت مبارکہ پر غور فرمائیے:

"وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ وَإِنْ يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُسَنَّدَةٌ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ أَنَّى يُؤْفَكُونَ." [المنافقون:٤]

"جب تم ان (کے تناسب اعضاء) کو دیکھتے ہو تو ان کے جسم تمہیں (کیا ہی)

Marfat.com

اچھے معلوم ہوتے ہیں اور جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو تم ان کی تقریر کو توجہ سے سنتے ہو گویا لکڑیاں ہیں جو دیواروں سے لگائی گئی ہیں۔ (بزدل ایسے کہ) ہر زور کی آواز کو سمجھیں (کہ) ان پر (بلا آئی) یہ (تمہارے) دشمن ہیں۔ ان سے بے خوف نہ رہنا۔ خدا ان کو ہلاک کرے۔ یہ کہاں بہکے پھرتے ہیں۔"

اس آیت مبارکہ میں منافقوں کی علامات واضح طور پر بیان کی گئی ہیں حتیٰ کہ ان کے جسموں، حرکات، علامات، گفتگو اور کردار واطوار کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ وہ اپنی فصاحت وبلاغت اور سحر انگیز خطابت کے زور پر ہزاروں آدمیوں کا مجمع اکٹھا کر کے انہیں بھیڑوں کی طرح اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں۔ وہ سہارا دی ہوئی لکڑی کی طرح خوب صورت دکھائی دیتے ہیں، لیکن وہ مسلمانوں کے کھلے دشمن ہیں۔ اس آیت مبارکہ میں ماضی وحاضر کے ان تمام زورِ بیان کے حامل لوگوں کا ذکر ہے، جو کوئی قابل ذکر کام کئے بغیر دین، امت اور وطن کے نام پر شور مچاتے ہیں۔ قرآن کریم اس قسم کے لوگوں کو انتہائی سخت انداز میں خطاب کر کے کہتا ہے: "اپنی صفوں میں باطل کو مت گھسنے دو اور اپنے کردار کو تضاد اور دوغلے پن سے بچاؤ۔"

مذکورہ بالا سطور میں جن کیفیات کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے، کوئی بھی انسان اِن میں کسی بھی لمحے مبتلا ہو سکتا ہے، اس لئے دعوت وتبلیغ کے میدان میں کام کرنے والے حضرات کو اس بارے میں بہت ہی محتاط اور حساس رہنا چاہیے۔

ھ۔ تبلیغ اور تعلق مع اللہ

جس قدر داعی میں اخلاص ہوتا ہے، اسی قدر اس کی باتوں اور شخصیت میں تاثیر ہوتی ہے۔ اگر اخلاص ختم ہو جائے تو شاندار گفتگو اور زورِ بیان میں کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ ہدایت کا دعوت وتبلیغ کے ساتھ کوئی بہت گہرا تعلق نہیں ہے، بلکہ ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے جسے اللہ تعالیٰ ہدایت نہ دینا چاہیں اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ

Marfat.com

ارشاد فرماتے ہیں:

''اِنَّکَ لَاتَھدِی مَن أَحبَبتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھدِی مَن یَّشَاءُ''

[القصص:٥٦]

''(اے محمد) تم جس کو دوست رکھتے ہو اسے ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔''

اس لئے دعوت الی اللہ میں تعلق مع اللہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں موجود اور غائب چیزوں کے خزانوں کی کنجیاں ہیں۔ ہدایت بھی ایک عظیم خزانہ ہے، جس کی کنجی بھی یقیناً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے پاس ہے، لہٰذا مبلغ اور مرشد کو مخاطبین کو پورے اخلاص کے ساتھ کسی بھی چیز کی دعوت دیتے وقت اس قادر مطلق ذات کی طرف رجوع کرنا چاہیے، جس کے پاس ہر چیز کی کنجی ہے۔

اس دور میں کتنی عبقری شخصیات آئیں اور چلی گئیں، فنِ خطابت اور تقریر میں یدطولیٰ رکھنے کے باوجود چند لوگوں سے بھی کوئی سنجیدہ کام نہ لے سکیں۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ بعض اعتبار سے وہ مخلص نہ تھے۔ وہ اپنے آپ کو ہمہ جہت اور ہر تبدیلی کا محرک خیال کرتے تھے ان میں سے بعض خطابت کے بادشاہ تھے۔ وہ ہزاروں لوگوں کو متاثر کر کے اپنے پیچھے لگا سکتے تھے، لیکن نفاق کی وجہ سے وہ کچھ بھی نہ کر پائے۔ وہ نماز پر لیکچر دیتے، لیکن خود نماز نہ پڑھتے تھے۔ وہ دوسروں کے سامنے اسلام کی خوبیاں بیان کرتے، لیکن خود اس پر عمل نہ کرتے تھے۔ ان کی زبانیں بلبل کی طرح چہکتیں، لیکن ان کے دل حسد، بغض اور ذاتی اغراض سے بھرے ہوتے۔ اسی لئے قرآن کریم نے منافقین کا ٹھکانہ جہنم کے سب سے نچلے طبقے کو قرار دیا ہے۔ ہر مخلص مبلغ کے لئے ضروری ہے کہ وہ بکثرت خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر نفاق سے براءت اور اخلاص کی توفیق کی دعا مانگا کرے۔ ہدایت تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس طرح انسان کے جسم کو قوت بخشتا ہے، اسی طرح اس کے دل کو اخلاص کی دولت سے بھی مالا مال کرتا ہے۔ اس لئے مبلغ کو جسمانی قوت یا اخلاص کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے۔ اسے

Marfat.com

یوں نہیں کہنا چاہیے کہ میں نے ایسا کیا اور میں نے ویسا کیا۔

قرآن نے ایک مثالی مؤمن کی جو تصویر پیش کی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ ایمان قول و فعل میں یکسانیت اور ہم آہنگی کا نام ہے۔ اس توازن کو برقرار رکھنا ہی اثر انگیزی کا بنیادی سبب ہے۔ یہ بات شیطانی وسوسہ اور خیال ہے کہ مجاہد اگرچہ خود باعمل نہ بھی ہو اور خود گناہوں سے اجتناب نہ بھی کرتا ہو اس کے لئے دوسروں کو درست اور اچھی بات سمجھا دینا ہی کافی ہے۔ اس قسم کے خیالات کا اسلامی تعلیمات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

دورِ حاضر میں آپ ایسے بہت سے لوگوں کو جانتے ہوں گے جو نئے نئے خیالات وافکار پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی مکارانہ صلاحیتوں کی بدولت سیاہ کو سفید کر کے پیش کرتے اور اسلام کی غلط ملط تشریحات کرتے ہیں، لیکن ان کے پیروکاروں میں مٹھی بھر بھی مخلص مسلمان شامل نہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ باتیں تو بہت کرتے ہیں، لیکن ان کے دل ایمان اور اسلام سے اس طرح مانوس نہیں جس طرح کہ گفتگو سے مانوس ہیں۔ ان کا طرزِ زندگی مغربی نظام کی برائیوں سے رنگا ہوا، مگر اس کی اچھائیوں سے خالی ہے۔ وہ عوام اور معاشرے سے اجنبیانہ انداز سے خطاب کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے معاشرے میں اجنبی سمجھے جاتے ہیں۔

اس قسم کے اختلافات کا بنیادی سبب اسلام سے ناواقفیت اور اس کا مطالعہ کر لینے کے بعد اس پر کما حقہ عمل نہ کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کا ایسا طرزِ عمل اسلام کی خاطر خود اپنی جدوجہد اور کوششوں کے بلند و بانگ دعووں کی تردید اور تحقیر کے مترادف ہے۔

ذرا قرآن کی طرف آیئے۔ وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی زبانی کتنے پیارے انداز میں کہتا ہے: ﴿وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ﴾ [هود:۸۸] ''میں نہیں چاہتا کہ جس امر سے میں تمہیں منع کروں خود اس کو کرنے لگوں۔'' یعنی جن باتوں سے میں تمہیں روکتا ہوں خود ان سے نفع اٹھانے کا سوچتا بھی نہیں ہوں۔ جب میں کہتا ہوں کہ سود حرام ہے تو خود سود لینے کا تصور بھی نہیں کرتا اور جب میں دوسروں کو بتاتا ہوں کہ رشوت حرام ہے تو خود رشوت لینے کا خیال بھی میرے

Marfat.com

دل میں نہیں گزرتا، چنانچہ ایسے انداز سے جب حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم کو دعوت دیتے تھے تو ان کا یہ طرز عمل خود ان کے سچے ہونے کا ضامن تھا۔ ہر نبی کے سچے ہونے کی یہی دلیل ہوتی ہے۔ دعوت و تبلیغ کے میدان میں کام کرنے والے حضرات کو ایسے امور سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے جس انداز سے اپنی قوم کو دعوت دی اس میں ہمارے لئے بھی راہنمائی موجود ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کے سامنے دعوت کے جو اصول پیش کئے تھے، قرآن کریم نے انہیں بڑی وضاحت کے ساتھ ہم تک پہنچایا ہے۔

رسول اعظم ﷺ جو کہتے اور جس بات کی دوسروں کو دعوت دیتے اس سے کہیں زیادہ خود کر کے دکھاتے۔ آپ ﷺ ساری انسانیت سے زیادہ عبادت گزار تھے، حالانکہ نبوت سے بڑھ کر کوئی مرتبہ نہیں اور نہ ہی اس کے ساتھ کسی اور مرتبے کا موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ ﷺ عبدیت کے سہارے آسمانوں کی بلندیوں تک تشریف لے گئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ﷺ کی عبدیت آپ ﷺ کی نبوت پر سبقت لے کر اس کے لئے پیش خیمہ بن گئی۔ قرآن کریم میں آپ ﷺ کو عبادت کرنے کا حکم ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ [الحجر: ۹۹] "اور اپنے پروردگار کی عبادت کئے جاؤ۔ یہاں تک کہ تمہاری موت (کا وقت) آجائے۔" آپ ﷺ تمام عمر اس حکم ربانی پر عمل پیرا رہے اور کبھی بھی اس سے غافل نہیں ہوئے۔ آپ ﷺ نے مقامِ عبدیت کو ایک لمحے کے لئے بھی نہیں چھوڑا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کی بات ذہنوں میں راسخ ہو جاتی اور دلوں میں اتر جاتی تھی۔ آپ ﷺ جو کچھ فرماتے مشکل ترین حالات میں بھی اس پر خود عمل کر کے دکھاتے۔ مثلاً جب ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ حضور ﷺ میں سب سے عجیب بات آپ نے کون سی دیکھی؟ تو آپ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں: "ایک رات آپ ﷺ میرے پاس لیٹے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "عائشہ چھوڑ میں تو اپنے رب کی عبادت کروں" میں نے کہا: "خدا کی قسم مجھے آپ ﷺ کی قربت بھی پسند ہے اور آپ ﷺ کی خوشی کی بات بھی پسند ہے۔" پھر آپ ﷺ کھڑے ہو گئے۔ وضو کیا اور نماز پڑھنے لگے۔ آپ ﷺ اتنا روئے کہ پہلے آپ کی گود تر ہوئی پھر آپ کی داڑھی مبارک

Marfat.com

بھی بھیگ گئی، لیکن اس پر بھی رونے کا سلسلہ نہیں ٹوٹا یہاں تک کہ زمین بھی تر ہوگئی۔ صبح کے وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ نماز کے لیے بلانے آئے تو آپ ﷺ نے رونا بند کیا۔[1]

یہ ہمارے نبی اعظم اور رسول اکرم ﷺ کی سیرت ہے۔ آپ ﷺ بلاشبہ داعی الی اللہ تھے۔ آپ کی سیرت کا سب سے اہم پہلو عبادتِ خداوندی تھا، جسے آپ ﷺ نے کبھی نہیں چھوڑا۔ بیماری اور تکالیف سے بھرپور زندگی کے آخری ایام میں بھی آپ ﷺ کو عبادتِ خداوندی کی ایسی ہی رغبت تھی جیسی کہ پہلے دن اور باوجود اس کے کہ آخری عمر میں آپ ﷺ کے لئے نشست و برخاست دشوار تھی آپ ﷺ نے اس شوق و رغبت کو عمر بھر برقرار رکھا۔ آپ ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات، اپنی اولاد اور اپنی امت کی دینی و دنیوی مصلحتوں کی خاطر تمام عمر اتنی مشقتیں اور تکالیف برداشت کیں جو کوئی اور انسان ایک دن بھی برداشت نہیں کر سکتا حتی کہ اسی وجہ سے آپ ﷺ کے جسمانی اعضاء کمزور پڑ گئے۔ اس سب کچھ کے باوجود آپ کے نوافل میں بھی کبھی کمی نہیں آئی۔ آپ ﷺ کے نوافل اس قدر طویل ہوتے کہ بعض اوقات ایک ایک رکعت میں آپ گھنٹوں کھڑے رہتے۔ اگر کھڑے ہونے کی سکت نہ رہتی تو بیٹھ کر ادا کرتے، لیکن کبھی بھی انہیں ترک نہ فرماتے۔[2] آپ ﷺ کی اس قدر سنجیدگی، وقار، اخلاص اور وفائے عہد کے کیا کہنے! معاملات کو سنجیدگی سے لینے اور موت تک ان کی پاسداری کرنے میں آپ ﷺ کی ذات گرامی بہترین نمونہ تھی۔

دعوت و تبلیغ کا ایک اہم پہلو قربِ الٰہی ہے۔ آپ ﷺ اس بارے میں بھی بہترین اسوہ تھے۔ اگر انسان کو قربِ الٰہی کا احساس نہ رہے تو اس کی زندگی بے مقصد ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے ذوق اور خواہشات کی پیروی کا عادی ہو جاتا ہے، جو بالآخر اس کے خطرات میں گھرنے کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔

---

(۱) ابن حبان: الصحیح، ۲/۳۸۶

(۲) دیکھئے: البخاری: الأذان، ۸۲، ۵۱

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ نے دعوت وتبلیغ کی ذمہ داری بحسن وخوبی ادا کی۔آپ ﷺ نے قرب الٰہی میں کبھی کمی نہیں آنے دی۔اکثر ایسا ہوتا کہ آپ ﷺ نماز پڑھا رہے ہوتے تو مقتدیوں کو یہ گمان ہونے لگتا کہ شاید یہ نماز کبھی ختم نہ ہوگی۔یہی کیفیت آپ ﷺ کی دعا کی تھی۔آپ ﷺ کے دست مبارک دعا کے لئے آسمان کی طرف اٹھتے تو واپس لوٹنے کا نام نہ لیتے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے۔اس دوران آپ ﷺ نے نوافل پڑھنے شروع کر دیئے۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے آپ ﷺ کے پیچھے اقتداء کی نیت باندھ لی۔آگے کیا ہوا یہ خود ابن مسعودؓ کی زبانی سنیئے۔وہ فرماتے ہیں: ''ایک رات میں نے نبی کریم ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھی آپ نے سورۃ البقرہ پوری پڑھی اس کے بعد آل عمران اس کے بعد سورۃ نساء اور پھر سورۃ المائدہ پڑھی۔آپ ﷺ نے اتنا لمبا قیام فرمایا کہ میں نے ایک برا ارادہ کرلیا۔'' سامعین نے پوچھا: ''آپ نے کیا ارادہ کیا تھا؟'' آپؓ نے جواب دیا: ''میں نے حضور ﷺ کی اقتداء چھوڑ کر بیٹھ جانے کا ارادہ کرلیا تھا۔''(1)

یہ تھا آپ ﷺ کا طرز زندگی۔آپ کسی بھی انسان سے بہت زیادہ عبادت کرتے اور پھر لوگوں کو عبادت کرنے کا کہتے۔آپ ﷺ اس معاملے میں اس قدر آگے بڑھے ہوئے تھے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود جن کا شمار اونچے درجے کے صحابہ میں ہوتا ہے، آپ ﷺ کے ساتھ دو رکعت نہ پڑھ سکے۔

آخری ایام میں جب آپ ﷺ کی زندگی کا سورج غروب ہو رہا تھا آپ ﷺ نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گود میں اپنا سر رکھا اور ملاء اعلیٰ کی طرف اپنی نگاہیں اٹھائیں آپ بہت تھکے ہوئے اور آخرت کی فکر میں ڈوبے ہوئے تھے حتیٰ کہ بعض اوقات آپ ﷺ پر بے ہوشی بھی طاری ہو جاتی۔ام المؤمنین حضرت عائشہ آپ ﷺ کی اس حالت کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرماتی ہیں: ''نبی اکرم ﷺ کی طبیعت بوجھل ہوگئی۔آپ نے پوچھا: ''کیا لوگوں نے نماز پڑھ

(1) البخاری: التہجد، ۹؛ مسلم: المسافرون، ۲۰۴؛ المسند: ۱/ ۳۸۵۔۳۹۶

Marfat.com

لی؟'' ہم نے کہا: ''نہیں، بلکہ وہ آپ کے انتظار میں ہیں۔'' آپ نے فرمایا: ''میرے لئے ٹب میں پانی ڈالو۔'' ہم نے حکم کی بجا آوری کی۔ آپ غسل فرما کر اٹھنے لگے تو آپ ﷺ پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد آپ ﷺ کو افاقہ ہوا تو آپ ﷺ نے پھر پوچھا: ''کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی؟'' ہم نے جواب دیا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! نہیں۔ وہ آپ کے انتظار میں ہیں۔'' آپ ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا: ''میرے لئے ٹب میں پانی رکھو۔'' آپ ﷺ اس میں بیٹھے، غسل فرمایا اور پھر اٹھنے لگے تو پھر آپ ﷺ پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔ کچھ دیر بعد آپ ﷺ کو افاقہ ہوا تو آپ ﷺ نے پھر استفسار فرمایا: ''کیا لوگ نماز پڑھ چکے ہیں؟'' ہم نے کہا: ''یارسول اللہ ﷺ! نہیں، بلکہ وہ آپ ﷺ کے انتظار میں ہیں۔'' آپ ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا: ''میرے لئے ٹب میں پانی رکھو۔'' آپ ﷺ نے اس میں بیٹھ کر غسل فرمایا اور پھر اٹھنے لگے تو آپ ﷺ پر غشی طاری ہوگئی۔ کچھ دیر بعد آپ کو افاقہ ہوا تو آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟'' ہم نے جواب میں عرض کیا: ''یارسول اللہ! نہیں۔ وہ آپ ﷺ کے انتظار میں ہیں۔''(۱)

آپ ﷺ کی تمام زندگی اسی طرح نماز کے اہتمام میں گزری اور اپنے رب کے ساتھ ملاقات کے وقت بھی آپ کی زبان مبارک پر نماز، نماز کے الفاظ تھے۔ آپ ﷺ کو ہمیشہ نماز کی فکر رہتی اور اسے پورے دھیان سے ادا فرماتے۔ آپ ﷺ زندگی کے تمام پہلوؤں میں ہمارے لئے بہترین اور مکمل نمونہ تھے۔ آپ ﷺ بجا طور پر انسان کامل، بہترین سردار اور مملکت کے منصف اور صابر سربراہ تھے۔ نبی کریم ﷺ کی ایک اور خصوصیت جس کا دعوت وارشاد میں مشغول حضرات کو خصوصیت سے اہتمام کرنا چاہیے آپ ﷺ کا متواضعانہ طرزِ زندگی اور تمام امورِ زندگی میں صحابہ کرام کے ساتھ شریک رہنا ہے۔ اگر مسجد بنانے کی ضرورت پیش آتی تو صحابہ کرام کے ساتھ آپ ﷺ اینٹیں اٹھانے میں پیش پیش ہوتے۔ اسی طرح اگر خندق کھودنے کی ضرورت پڑتی تو آپ کدال

(۱) البخاری: الأذان، ۵۱؛ مسلم: الصلوۃ، ۹۰

Marfat.com

اٹھائے چٹان توڑنے میں اپنے صحابہ کی مدد کرتے دکھائی دیتے۔[1]

آپ ﷺ ایک عام آدمی کی طرح زندگی گزارتے اور اپنی باتوں پر پہلے خود عمل کر کے دکھاتے۔ اگر آپ ﷺ لوگوں کو دنیا سے بے رغبتی کی ترغیب دیتے تو زہد اختیار کرنے میں خود سب سے پیش پیش ہوتے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کے گھر میں کھانا پکانے کے لئے مہینوں آگ نہ جلتی اور آرام کرنے کے لئے آپ ﷺ کو بستر دستیاب نہ ہوتا۔[2]

آپ ﷺ حرام سے بہت ہی زیادہ اجتناب فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے دیکھا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے صدقہ کی کھجور اپنے منہ میں ڈال لی ہے تو آپ ﷺ جلدی سے اٹھے اور ان کے منہ سے اسے نکال دیا۔[3] باوجود اس کے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اس وقت پانچ چھ سال کے بچے تھے، لیکن چونکہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی آل پر صدقہ حرام تھا اس لئے آپ ﷺ نے ان کے منہ سے صدقہ کی کھجور نکال دی۔

ایک رات آپ ﷺ کو اپنے پہلو میں ایک کھجور پڑی ہوئی ملی۔ آپ ﷺ نے اسے اٹھا کر کھا لیا، لیکن پھر رات بھر آپ ﷺ کو نیند نہیں آئی۔ صبح کے وقت آپ ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ نے آپ ﷺ سے پوچھا: ''یارسول اللہ! رات آپ کو نیند نہیں آئی؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''رات مجھے اپنے پہلو میں ایک کھجور پڑی ہوئی ملی میں نے اسے اٹھا کر کھا لیا۔ ہمارے گھر میں صدقہ کی کھجوریں بھی ہوتی ہیں۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ کھجور بھی صدقہ کی نہ ہو۔''[4] حالانکہ یہ کھجور آپ ﷺ ہی کے مال میں سے تھی، کیونکہ صدقہ کی کھجوریں آپ ﷺ ایک مخصوص جگہ پر رکھا کرتے تھے۔

---

(۱) دیکھئے: المسند: ۲/۳۸۱؛ ابن کثیر: البدایۃ، ۳/۲۵۱، ۴/۹۷؛ الواقدی: المغازی، ۲/۴۴٦

(۲) دیکھئے: البخاری: الرقاق، ۱۷؛ مسلم: الزھد، ۲۸؛ ابو داؤد: اللباس، ۴۲

(۳) دیکھئے: البخاری: الزکاۃ، ٦۰؛ مسلم: الزکاۃ، ۱٦۱

(٤) المسند: ۲/۱۹۳

Marfat.com

یہ حرام مال سے بچنے کا اہتمام کرنے کی بہترین مثال ہے۔ کامل مؤمن اور مرشد کو بھی یہی طرز اختیار کرنا چاہیے۔

و۔ تبلیغ اور دعا

حضور اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا ایک اہم پہلو دعا بھی ہے۔ میں اس پہلو پر بھی کچھ روشنی ڈالنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام بلکہ ساری امت کو دعا کا خصوصی اہتمام کرنے کا حکم فرمایا ہے اور ﴿قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ﴾ [الفرقان: ۷۷] ''کہہ دو کہ اگر تم (خدا کو) نہیں پکارتے تو میرا پروردگار بھی تمہاری کچھ پرواہ نہیں کرتا۔'' ایسی آیات مبارکہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ آپ ﷺ مسلسل دعا کی کیفیت میں رہتے تھے۔ آپ ﷺ سونے اور جاگنے، کھانے اور پینے، کپڑے پہننے اور اتارنے حتی کہ بیت الخلاء میں جانے اور وضو کرنے کے اوقات میں بھی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ آپ ﷺ اس قدر دعائیں مانگا کرتے تھے کہ دنیا میں کوئی اور انسان اس قدر دعائیں نہیں مانگ سکتا۔ آپ ﷺ ہر ہر قدم پر اللہ کا ذکر کیا کرتے۔ اپنے تمام معاملات میں اللہ ہی کی طرف رجوع کیا کرتے اور ہر کام میں اسی کی خوشنودی کے طالب ہوتے۔ کسی اور کے لئے یہ مقام حاصل کرنا ممکن نہیں۔

عبرتوں اور نصیحتوں سے بھرپور اس زندگی نے پورے عالم اسلامی کے تمام طبقات کی نظریں آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کی طرف متوجہ کر دی ہیں۔ گزشتہ چودہ سو سالوں سے آپ ﷺ کی سیرت کا بڑے اہتمام اور مربوط انداز سے مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ روئے زمین پر خدا کے ساتھ آپ ﷺ سے زیادہ کسی کو تعلق نصیب نہیں ہوا۔

اگر حضور ﷺ کی سیرت مبارکہ کا مطالعہ کیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا آپ ﷺ کی باوقار زندگی فلم کی صورت میں دکھائی جا رہی ہے۔ آپ ﷺ کے کھانے، پینے، لباس اور نشست و برخاست کی کیفیات، آپ ﷺ کی گفتگو، اندازِ خطابت، سیاسی موقف اور بین الاقوامی معاہدوں کی

Marfat.com

تفصیلات عوام الناس کے حافظوں اور اجتماعی شعور میں محفوظ ہو کر اسلامی معاشروں میں امن کے قیام کی ضامن بن چکی ہیں۔ آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں کوئی خلا ہے اور نہ زندگی کے کسی حصے میں آپ ﷺ کا اللہ تعالیٰ سے کبھی تعلق ٹوٹا۔ آپ ﷺ کی زندگی کی ہر حالت اور کیفیت حتیٰ کہ آپ ﷺ کا کھانا پینا اور سونا جاگنا، تعلق مع اللہ، عبادتِ خداوندی اور اس کی اطاعت میں گزرا۔ اسی لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیاں آپ ﷺ کی احادیث، اقوال، کردار اور حالات کے رنگ میں رنگ گئیں۔ صحابہ کرام کے ہاں دینی زندگی پر دوام کا جو اہتمام ہمیں نظر آتا ہے، اس کا سبب دراصل وہ اہتمام ہے، جس کا مشاہدہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں کیا تھا۔

چنانچہ جب آیت مبارکہ: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ [آل عمران: ۱۰۲] ”مومنو! خدا سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔“ نازل ہوئی تو پریشانی کی وجہ سے صحابہ کرام سے کھانا پینا تک چھوٹ گیا، کیونکہ اس کے بغیر کما حقہ تقویٰ کا حصول کیسے ممکن تھا؟ مزید برآں آیت کے آخر میں: ﴿ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ ”اور مرنا تو مسلمان ہی مرنا“ کا اضافہ اس طرف اشارہ کر رہا تھا کہ کما حقہ خوفِ خدا کے بغیر حالتِ اسلام پر مرنا بھی دشوار ہے۔ صحابہ کرام نے اس معاملے کو بڑی سنجیدگی سے لیا۔ وہ گھروں میں عبادت و ریاضت میں اس قدر مشغول ہو گئے کہ ان کے پاؤں میں ورم آ گیا اور ان کی پیشانیاں زخمی ہو گئیں۔ وہ گھروں سے صرف مسجد میں باجماعت نماز کے لئے نکلتے۔ چند ہی دنوں میں وہ بہت لاغر اور کمزور ہو گئے بلکہ مرنے کے قریب پہنچ گئے۔ رسول اللہ ﷺ اس کیفیت سے باخبر تھے، لیکن آپ ﷺ کو ان میں اس اچانک رونما ہونے والی تبدیلی کا سبب معلوم نہ تھا اور نہ ہی صحابہ کرام نے اپنے دلوں کی مخفی کیفیت کا اظہار کیا کہ مبادا حکم خداوندی کی مخالفت نہ ہو جائے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ایک اور آیت کریمہ: ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ۱۶] ”سو جہاں تک ہو سکے خدا سے ڈرو۔“ کا نزول ہوا جس کے بعد صحابہ کرام کی جان میں جان آئی اور انہیں کچھ راحت

Marfat.com

کا احساس ہوا۔[1]

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام قرآنی آیات کے بارے میں کس قدر حساس اور محتاط تھے۔ قرآنی آیات کو عملی طور پر اپنی زندگی میں نہ اپنانا ان کے لئے ممکن نہ تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے راہنما و ہادی حضورِ اقدس ﷺ کا اسوہ یہی تھا۔ یہ کیفیت بعد کے بعض ادوار میں بھی برقرار رہی۔

یہاں ایک اور بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے وہ یہ کہ جب تک اسلام کے فہم کے ساتھ ساتھ اسے عملی طور پر اپنایا نہ جائے اس وقت تک تبلیغ کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ صحابہ کرام کی طرح زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی اسلامی تعلیمات کی پیروی کرنی چاہیے۔

فریضہ تبلیغ کی کچھ اپنی خصوصیات ہیں۔ اسے ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ چونکہ یہ محض مفروضات اور خیالی تصورات پر مبنی نہیں اس لئے اسے عملی زندگی میں اپنائے بغیر سمجھنا ممکن نہیں۔ نورانی مشائخ چودہ سو سال سے اپنے کردار کے ذریعے دعوت وارشاد کا کام کرتے چلے آرہے ہیں۔ ان کی پوری زندگی اور کردار عمل سے عبارت ہوتا تھا۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو دیکھئے: نماز کی حالت میں آپؓ کو خنجر سے زخمی کر دیا گیا۔ آپؓ پر بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے اور کھانا پینا ممکن نہیں رہتا۔ آپؓ کی خدمت پر مامور صحابی نے جب پوچھا: ''کیا کچھ کھانا پسند کریں گے؟'' آپؓ نے آنکھ کے اشارے سے سختی سے انکار کر دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آپؓ کے لئے بات کرنے کے لئے زبان ہلانا بھی ممکن نہ تھا، لیکن جب نماز کا وقت ہوا اور اسی صحابی نے سیدنا عمر فاروق کے قریب منہ کر کے نماز کا وقت ہونے کی اطلاع دی تو آپؓ فوراً اپنی جگہ پر سیدھے ہو گئے اور کہنے لگے: ''میری نماز... میری نماز...''

دراصل انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا یہی طرزِ عمل دیکھا تھا۔ اس طرح سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نماز میں خنجر سے زخمی ہونے کے باوجود اپنی زندگی کے آخری سانس تک نماز کا اہتمام

(1) دیکھئے: تفسیر ابن کثیر، ۸/۱٦٦

Marfat.com

کرتے رہے۔(۱) ایک اور مثال ام المومنین حضرت عائشہؓ کی زندگی سے لیجیے: ایک دفعہ انہیں جہنم کا خیال آیا تو رونے لگ پڑیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا: ''کیوں رو رہی ہو؟'' انہوں نے جواب دیا: ''مجھے جہنم کا خیال آ گیا جس کی وجہ سے رو رہی ہوں۔''(۲) اس کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے ہر رات حضور ﷺ کا یہی طرز عمل دیکھا تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنے عمل سے ان کی تربیت فرمائی تھی۔

صحابہ کرام صرف نماز کی تبلیغ میں ہی اس احتیاط اور حساسیت کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ تمام دینی اور ایمانی کاموں کے بارے میں ان کا یہی طرز عمل تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا؟ آخر انہوں نے تبلیغ کا کام رسول اکرم ﷺ سے سیکھا تھا۔ ہمیں بھی اپنی دعوت و تبلیغ کو مؤثر بنانے کے لئے صحابہ کرام کی طرح دینی طرز زندگی اپنانا ہوگا۔

دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریوں اور اس کی مشغولیت کی وجہ سے ہمارے دیگر کاموں میں خلل نہیں آنا چاہیے، بلکہ مخاطبین کے ہاں قابل اعتبار بننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم مخاطبین کی بہ نسبت زیادہ ذوق و شوق سے اپنی زندگی کو اپنی گفتار کے مطابق ڈھالیں۔ اگر کردار اور گفتار میں ہم آہنگی نہ ہو تو انسان اپنا اعتبار کھو بیٹھتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت مبارکہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے مشغولیات کی کثرت کے باوجود کسی چھوٹے سے دینی معاملے میں بھی کبھی غفلت نہیں برتی۔ آپ ﷺ نے تیئس سال کے مختصر عرصے میں ایک عظیم مملکت کی داغ بیل ڈال دی۔ آپ ﷺ کو اپنی امت کی تمام مشکلات کا ادراک اور اہتمام تھا۔ دنیا بھر کی مصروفیات کے باوجود آپ ﷺ نے اپنے اہل خانہ کو کبھی نظر انداز نہیں کیا اور نہ ہی کسی کام میں سستی کا مظاہرہ کیا، یہاں تک کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے (آپ ﷺ پر فتوحات کی کثرت کی بنا پر) آپ ﷺ سے استغفار کی کثرت کا مطالبہ کیا۔ آپ

---

(۱) دیکھیے: الهيثمي: مجمع الزوائد، ۱/ ۲۹۵؛ ابن سعد: الطبقات، ۳/ ۳۵۰-۳۵۱

(۲) ابوداؤد: السنة، ۲۵؛ الحاكم: المستدرك، ۴/ ۶۲۲۔

Marfat.com

علیہ السلام ہمیشہ اپنے رب کے احکام پر عمل پیرا رہتے۔[1]

اسی طرح مرتدین کے خلاف شدید جنگ اور دن رات کی پریشانیوں کے باوجود سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے کبھی تہجد کی نماز نہیں چھوٹی اور نہ ہی تلاوتِ قرآن کے دوران آپ انؓ کی آہ وزاری میں کمی آئی۔[2] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فارس وروم کی دو عظیم سلطنتوں کو زیر کیا، لیکن اپنے نفس کے محاسبے سے لمحہ بھر کے لئے بھی غافل نہ ہوئے۔[3]

جن ایام میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آزمائش میں مبتلا تھے، ان دنوں وہ نفلی روزے رکھتے اور مسلسل تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتے حتی کہ اسی حالت میں انہیں شہید کر دیا گیا۔ ان کی پیشانی سے بہنے والے خون کے قطروں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کے سامنے کھلے قرآن مجید کے صفحات پر اپنے نشانات ثبت کر دیئے۔ جس آیت مبارکہ پر ان کے خون کے قطرے گرے تھے، اس میں عبرت کا بڑا سامان موجود ہے۔ وہ آیت ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ [البقرة:١٣٧] ''ان کے مقابلے میں تمہیں خدا ہی کافی ہے اور وہ سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔'' تھی۔[4]

حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک طرف میدانِ جنگ کے شیر تھے تو دوسری طرف ان کے پہلو سجدے کی حالت میں مناجات کی خاطر بستر سے جدا رہتے۔ آذان کی آواز سن کر آپؓ کے چہرے کا رنگ زرد پڑ جاتا اور آپؓ پر بخار میں مبتلا شخص کی سی کپکپی طاری ہو جاتی۔

ان تمام حضرات نے بحسن وخوبی دعوت ارشاد کی ذمہ داریاں ادا کیں۔[5]

---

(١) دیکھئے: سورة النصر

(٢) دیکھئے: الكاندهلوی: حياة الصحابة، ٣/١٤٣؛ ابو نعيم: الحلية، ١/٣٠

(٣) ابو نعيم: الحلية، ١/٤٩، ٤٨؛ ابن الاثير: اسد الغابة، ٤/١٥٧؛ ابن سعد: الطبقات، ٤/٢٩٣

(٤) دیکھئے: المسند: ١/٧٢؛ ابن الاثير: أسد الغابة، ٣/٥٩٤؛ حياة الصحابة: ٣/٢٨٦

(٥) دیکھئے: ابن الجوزی: صفة الصفوة، ١/١٢٨

Marfat.com

داعی کسی بھی عمر کا ہو اور چاہے اس کا کوئی سا پیشہ ہو، اسے اپنی گفتار و کردار میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں مخلص ہونا چاہیے۔ داعی خواہ شیخ ہو، امام مسجد ہو، واعظ ہو، اسکول ٹیچر ہو یا یونیورسٹی کا پروفیسر ہو، کارخانے کا مزدور ہو یا طالب علم، سب پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ حسب استطاعت وحالات اپنی باتوں کو عملی جامہ پہنائیں اور اپنی ذمہ داری بلا کم و کاست ادا کریں۔ دعوت و تبلیغ میں جتنی اہمیت موضوع کی ہوتی ہے اتنی ہی اہمیت داعی کے اخلاص کی ہوتی ہے۔ مبلغ کے اخلاص کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں اپنی گفتار کے اثرات کس قدر محسوس کرتا ہے، نیز کس حد تک اپنے کردار کو اپنی گفتار کے مطابق ڈھالتا ہے۔ اخلاص و عمل سے خالی تبلیغ بظاہر کتنی ہی کامیاب کیوں نہ دکھائی دے وہ بے اثر رہتی ہے۔ ایک اور پہلو سے دیکھیں تو ایسی تبلیغ کی وجہ سے انسان کو آخرت میں عذابِ خداوندی کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی ایک صورت درج ذیل الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

معراج کی رات میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جس کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا: ''یہ کون لوگ ہیں؟'' جواب ملا: ''یہ دنیا کے وہ خطیب حضرات ہیں، جو دوسروں کو تو اچھائی کی تلقین کرتے، لیکن اپنے آپ کو بھول جاتے، حالانکہ وہ کتابِ خداوندی کی تلاوت بھی کرتے۔ کیا وہ سمجھتے نہیں؟[1]

صورتِ حال ہمارے سامنے ہے۔ یہ ان لوگوں کا انجام ہے جو اپنے آپ کو بھلا دیتے ہیں اور لوگوں سے جو باتیں کہتے ہیں خود ان پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ آج کے دور میں گفتار کی بجائے کردار کے غازیوں کی ضرورت ہے۔ صرف یہی لوگ ہماری آج کی گھمبیر مشکلات کا حل پیش کر سکتے ہیں۔ بے عمل اور رات دن باتیں بنانے والے اہل علم امت کی نجات کے لئے کوئی کردار ادا نہیں کر سکتے۔ سلطنت عثمانیہ کے سقوط کے وقت اس کے خزانے ہزاروں کتابوں سے بھرے پڑے تھے، لیکن یہ کتابیں اس عظیم سلطنت کو سقوط سے نہیں بچا سکیں۔ تاثیر کے اعتبار سے لائبریری

---

(۲) المسند: ۳/ ۱۲۰۔ ۲۳۹، ۲۳۱

Marfat.com

کی الماری میں لگی کتابوں اور انسان کے ذہن میں موجود معلومات میں کوئی فرق نہیں۔ اصل مقصد تو اپنے علم پر عمل کرنا ہے۔ سرورِ کائنات حضرت محمد ﷺ نے یہ بات درج ذیل حدیث میں ارشاد فرمائی ہے: ''مجھے اپنی امت پر تین باتوں کا سب سے زیادہ اندیشہ ہے: عالم کی لغزش، منافق کا قرآن کریم کی بنیاد پر بحث و مباحثہ اور دنیا کی فراوانی۔''(1)

جب علماء منافقت اور دھوکا بازی کرنے لگیں گے اور منافق لوگ علمی برتری کے دعوے کرنے لگیں گے تو اس امت کا اللہ ہی حافظ ہوگا۔

ہم اکثر اس بارے میں غفلت برتتے ہیں۔ ہر مرشد و داعی کو اس بارے میں بہت محتاط رہنا چاہیے۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہماری دعوت و تبلیغ میں کمزوری کا بنیادی سبب یہی ہے۔ اپنے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کے برتاؤ کو یاد کرتے وقت ہمیں اس بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔

۸۔ تزکیہ اور اخلاص کی اہمیت

داعی کو اپنے افعال و کردار پر قابو رکھنا چاہیے۔ اسے خواہ کتنی ہی روحانی ترقی حاصل کیوں نہ ہو جائے تواضع اور انکسار کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ تواضع اسلام کی روح ہے۔ دیگر نظامہائے حیات میں افراد کے باہمی تعلقات میں انا پرستی کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ انا پرستی ہمیشہ غرور اور تکبر کو جنم دیتی ہے، جس کے نتیجے میں غرور و تکبر تواضع کی جگہ لے لیتے ہیں جبکہ خود پسندی اور تعلّی، انکسار کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ بہت سی انسانی کمزوریاں انسان میں موجود انا پرستی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اگر ان کمزوریوں کو ترک کر کے ان کی جگہ خوبیوں کو نہ اپنایا جائے تو انسان روحانی اعتبار سے موت کا شکار ہو جاتا ہے، اسی لئے میں تاکید کے ساتھ کہتا ہوں کہ جس شخص کے دل میں غرور و تکبر کے جراثیم موجود ہوں، چاہے وہ روحانی اعتبار سے کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لے اور کتنی ہی اہم ذمہ داریاں کیوں نہ اٹھا لے، وہ کبھی بھی مرشد یا داعی نہیں بن سکتا۔ تبلیغ اور ایسے شخص کے درمیان کوئی تعلق نہیں۔

---

(1) الطبرانی: المعجم الکبیر، ۱۳۸/۲۰

Marfat.com

داعی ہر جگہ اور ہر قسم کے حالات میں اپنی صورت حال پر نظر رکھتا ہے۔ وہ موسم کے ساتھ نہیں بدلتا جاتا۔ خدا کی نصرت و توفیق کے شاملِ حال ہو جانے کے بعد اس کی نگاہیں نہیں بھٹکتیں۔ وہ جس کام کو شروع کرتا ہے اسے آخر تک نبھاتا ہے۔ جس تواضع کے ساتھ وہ اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے اسی تواضع کے ساتھ وہ اپنے پروردگار کے حضور پیش ہوتا ہے۔ دنیا بدل جاتی ہے۔ بڑے بڑے انقلابات رونما ہو جاتے ہیں۔ لوگ ستاروں کی تسخیر کر لیتے ہیں، لیکن اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اس کے کردار اور معاملات میں پہلے کی طرح ہی انکسار اور تواضع جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

آج ہمیں اسی قسم کے مبلغ اور داعی حضرات کی شدید ضرورت ہے۔ یہی لوگ اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ لوگوں کی بڑی تعداد ان کی پیروی کرے۔ ان کی باتوں کو غور سے سنے اور ان کے کردار کو اپنائے یہاں تک ان کے دلوں کی کیفیات ان کی طرف منتقل ہونے لگیں۔

داعی کا امتیازی وصف تواضع اور انکسار ہوتا ہے۔ اس کی زندگی سادہ اور فطری ہوتی ہے۔ اس کا دل خلوص اور سادگی سے لبریز ہوتا ہے اور اس کی آنکھوں میں سادگی کی نورانیت جھلکتی ہے۔ حاصل یہ کہ اس کے رہنے سہنے اور گردوپیش میں ہر طرف سادگی اور تواضع ہی نظر آتی ہے۔

دراصل داعی یہ اوصاف حمیدہ قرآن کریم اور رسول اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ سے حاصل کرتا ہے۔ آپ ﷺ کی ساری عمر سادگی اور تواضع سے عبارت ہے۔ جس طرح آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں دعوت و تبلیغ کے ابتدائی ایام میں تواضع کے پیکر تھے، اسی طرح آپ ﷺ مکہ مکرمہ سے نکالے جانے کے آٹھ سال بعد مدنی لشکر کے ہمراہ فاتح کی حیثیت سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو تب بھی آپ ﷺ پر تواضع کی کیفیت غالب تھی حتی کہ آپ ﷺ کا سر مبارک تواضع سے اتنا جھکا ہوا تھا کہ اونٹنی کی گردن پر لگ رہا تھا۔ کیا مرورِ ایام کے ساتھ تواضع میں اضافے کی اس سے بہتر کوئی اور مثال پیش کی جا سکتی ہے؟

ایک دفعہ آپ ﷺ کو پیاس محسوس ہوئی تو آپ نے پانی مانگا۔ اس وقت زمزم کے کنویں کے پاس پیالے پڑے تھے، جن میں لوگ پانی پی رہے تھے۔ ایک صحابی کسی قریبی گھر سے

Marfat.com

آپ ﷺ کا خصوصی پیالہ لینے کے لئے لپکے، لیکن آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ وہ زمزم کے کنویں کے پاس رکھے پیالوں میں سے کسی پیالے میں پانی لائیں۔ آپ ﷺ نے اپنے آپ کو کبھی بھی عام لوگوں سے ممتاز نہیں جانا۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ''میں عام لوگوں کی طرح ایک انسان ہوں۔ عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے اپنی ساری عمر کھجور کی چھال کی بنی ہوئی ایک چٹائی پر گزار دی۔ اسی چٹائی پر آپ کا انتقال ہوا، بلکہ اسی چٹائی کی جگہ آپ کی تدفین ہوئی۔ وہ جگہ یقیناً جنت سے بھی زیادہ مقدس ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی میں کسی قسم کی کج روی دکھائی نہیں دیتی۔ دعوت و تبلیغ کا یہی طریق کار ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور اسلوب نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ موجودہ ترکی سے نو یا سات گنا بڑے رقبے پر حکومت کرتے تھے، لیکن جب سے آپ اسلام لائے آپؓ کے طرز زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ آپؓ خلافت کی ذمہ داری اٹھاتے وقت مدینہ کے غریب ترین شہری تھے اور شہادت کے وقت بھی یہی صورتِ حال تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ آپؓ کے کپڑوں پر تیس سے زائد پیوند لگے ہوتے تھے۔ (۱)

کئی دفعہ آپ کو تلاش کرنے والے آپؓ کو ''بقیع'' میں کسی قبر کے سرہانے سر رکھے کسی گہری سوچ میں غرق پاتے۔ (۲) یہ اس عظیم خلیفہ کا طرز زندگی ہے، جس نے بادشاہوں کے سروں سے تاج اتار کر دوسرے لوگوں کو پہنا دیئے۔ اس قسم کا طرز زندگی آپ رضی اللہ عنہ کی زندگی کا مؤثر ترین پہلو تھا۔ اگر میں یہ کہوں تو شاید غلط نہ ہو کہ یہ دراصل زبانِ حال کی تاثیر تھی جو زبانِ قال کی تاثیر سے بدرجہا زیادہ ہوتی ہے۔

---

(۱) دیکھئے: شبلی النعمانی: عمر و ادارۃ الدولۃ، ۲/۳۹۳

(۲) دیکھئے: الکاندھلوی: حیاۃ الصحابۃ، ۳/۵۸۷

Marfat.com

حاتم اصم بہت بڑے محدث گزرے ہیں۔ایک دفعہ انہیں پتا چلا کہ مشہور فقیہ اور شہر رُے کے قاضی محمد بن مقاتل بیمار ہیں، چنانچہ وہ اپنے ایک دوست کے ہمراہ ان کی عیادت کے لئے گئے۔ان کے دروازے پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عظیم الشان محل کے سامنے کھڑے ہیں۔ان کے ذہن میں ایک عالم کے گھر کا کچھ اور ہی نقشہ تھا۔حاتم کو اندر جانے میں تردد ہوا، لیکن اپنے دوست کے اصرار پر اندر چلے گئے، لیکن اندر آ کر ندامت ہوئی۔گھر کا اندرونی حصہ بیرونی حصے سے بھی زیادہ شاندار تھا۔محمد بن مقاتل کے کمرہ خاص میں نرم و گداز بستر لگے ہوئے تھے، جن پر وہ آرام کر رہے تھے۔پاس ہی ایک ملازم انہیں پنکھا جھل رہا تھا۔یہ منظر دیکھ کر حاتم کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔محمد بن مقاتل کوئی عام آدمی نہیں تھے، بلکہ ایک جلیل القدر عالم تھے۔یقیناً ان کی جائے نماز نالہ سحر گاہی سے تر ہوتی ہوگی، لیکن اپنی کمزوری اور آسودہ زندگی کی طرف میلان کی وجہ سے نصیحت کے محتاج تھے جبکہ حاتم اس فریضے کی ادائیگی پوری اہلیت رکھتے تھے، چنانچہ ان کے درمیان درج ذیل گفتگو ہوئی:

حاتم: آپ نے یہ علم کہاں سے حاصل کیا؟

محمد بن مقاتل: قابل اعتماد لوگوں سے۔

حاتم: انہوں نے یہ علم کس سے لیا؟

محمد بن مقاتل: رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام سے۔

حاتم: رسول اللہ ﷺ نے یہ علم کس سے لیا؟

محمد بن مقاتل: جبریل امین علیہ السلام سے۔

حاتم: تو اللہ تعالیٰ سے حضرت جبرائیل علیہ السلام پھر حضور اقدس ﷺ پھر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور پھر قابل اعتماد راویوں کے ذریعے آپ تک جو علم پہنچا، کیا اس میں یہ ہے کہ علماء کو خدام و حشم اور جاہ و جلال کے ساتھ رہنا چاہیے؟

Marfat.com

محمد بن مقاتل: نہیں۔

حاتم: کیا آپ نے سنا نہیں کہ جو شخص دنیا سے بے رغبتی اور آخرت سے رغبت رکھے۔ مساکین سے محبت کرے اور آخرت کی تیاری کرے اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے بڑے مراتب سے نوازا جائے گا؟

یہ سن کر محمد بن مقاتل کی بیماری میں مزید شدت آ گئی۔ ان کے حاشیہ برداروں نے حاتم سے کہا: ''تم تو ایسی باتیں کر کے انہیں مار ہی ڈالو گے۔'' حاتم نے جواب دیا: ''بلکہ تم اپنے طرزِ عمل سے انہیں ہلاکت کے منہ میں دھکیل رہے ہو۔''

دعوت و تبلیغ سے منسلک حضرات جب لوگوں کے بہت زیادہ التفات کے باعث بدلنے لگیں تو ان کے سامنے خاموشی اختیار کرنا ان کے ساتھ بدسلوکی اور انہیں قتل کرنے کے مترادف ہے، چنانچہ اس طرح حاتم اصم نے اس موقع پر اپنی ذمہ داری ادا کی۔

حاتم اصم ہی کے معاصر اور ممتاز عالم امام طنافسی تھے۔ حکومت کے ساتھ مضبوط تعلقات کے باعث وہ بڑی آسودہ زندگی گزار رہے تھے۔ حاتم اصم ایک دن ان کے پاس بھی تشریف لے گئے اور ان سے کہا: ''میں ایک دیہاتی آدمی ہوں، دین کی بنیادی باتوں سے بھی ناواقف ہوں۔ براہ کرم مجھے وضو کا طریقہ سکھا دیجیے؟'' امام طنافسی نے کہا: ''مجھے بڑی خوشی ہوگی۔'' اور ایک ملازم کو برتن میں پانی لانے کے لئے کہا۔ جب پانی آ گیا تو انہوں نے وضو کر کے دکھایا اور تمام اعضاء کو تین تین مرتبہ دھویا اور پھر حاتم کو مخاطب کر کے کہا: ''اس طرح وضو کیا کرو۔''

حاتم نے کہا: ''حضرت ذرا ٹھہریئے! میں آپ کے سامنے ایک مرتبہ وضو کرنا چاہتا ہوں تا کہ میری تسلی ہو جائے کہ واقعی میں درست طریقے سے وضو کرتا ہوں۔'' چنانچہ حاتم نے ان کے سامنے وضو کیا اور جب چہرہ دھونے لگے تو انہیں چار مرتبہ دھویا۔ اس پر امام طنافسی انہیں ٹوکا:

''خدا کے بندے! تم نے تو اسراف کر دیا۔''

حاتم نے پوچھا: کیسے؟

Marfat.com

امام طنافسی نے بتایا کہ آپ نے اپنا چہرہ چار مرتبہ دھوتے رہے۔

حاتم نے کہا: سبحان اللہ! میرے لئے تو ایک چلو پانی میں بھی اسراف ہے اور آپ کے لئے اِس مال و دولت میں بھی اسراف نہیں؟ یہ سن کر امام طنافسی جان گئے کہ اس شخص کا مقصد وضو کا طریقہ سیکھنا نہیں بلکہ میری غلطی پر تنبیہ کرنا ہے۔[1] امام طنافسی ایک جلیل القدر عالم تھے، لیکن حکومت کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے ان کا طرز زندگی بدل گیا تھا، لیکن امام حاتم نے بڑے عمدہ طریقے سے انہیں تنبیہ کردی کہ یہ طرز زندگی دعوت وتبلیغ سے منسلک لوگوں کے لئے مناسب نہیں۔

دورِ حاضر میں جو لوگ متکبرانہ طرز زندگی اختیار کرتے ہیں آخر کار ان کے قدم پھسل جاتے ہیں، اگرچہ انہیں خود اس بات کا ادراک نہیں، لیکن یہ مشاہدہ ہے کہ عام طور پر جو لوگ اپنی خودی کا ادراک نہیں کر پاتے، وہ اپنی شخصیت کی کمی کا تدارک اعلیٰ معیارِ زندگی کے ذریعے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس قسم کی سوچ کا سبب یقیناً احساسِ کمتری ہے، لیکن مضبوط قسم کی شخصیت کے مالک لوگ اس قسم کے ذرائع سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ مبلغ اور مرشد بھی کامل شخصیت کا حامل ہوتا ہے، اس لئے اس کے دل میں اس قسم کی آسودہ زندگی گزارنے کا خیال نہیں گزرتا۔

انکسار وقار اور عظمت کی علامت ہے، جو شخص اپنے آپ کو دوسرے لوگوں کی طرح ایک انسان سمجھتا ہے، وہ انسانیت کے مقام کا ادراک کر لیتا ہے۔ جن لوگوں کی تعظیم مال واسباب کی وجہ سے کی جاتی ہے، ان کی تعظیم مال واسباب کے ختم ہوتے ہی رخصت ہو جاتی ہے۔ اگر مالداری، دولت، حکومت اور منصب کسی کی بڑائی اور عظمت کا سبب ہیں تو ان اشیاء کے ہاتھ سے نکلتے ہی اس کی بڑائی اور عظمت بھی تحلیل ہو جائے گی، حالانکہ انسان کی قیمت کا مدار تو ان کے دل کے غنا پر ہوتا ہے۔ حالات کے بدلنے سے اس غنا میں زیادتی ہوتی ہے اور نہ کمی۔ اس کی شخصیت برقرار رہتی ہے۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آتی۔ کامل شخصیت کے حامل انسان کی پہچان مال ودولت نہیں ہوتی۔ موت یا لوگوں سے جدائی اسے فنا نہیں کرسکتی، بلکہ وہ ہزاروں لوگوں کے دلوں میں زندہ رہتا ہے۔

(۱) ابو نعیم: الحلیة، ۸/۸۱

Marfat.com

چاہے اس کا کوئی گھر بار اور ٹھکانہ نہ ہو اور اس کی زندگی بوریا نشینی میں گزر جائے، وہ مرجع خلائق بنا رہتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ "داعی اور مرشد حضرات کو سادہ اور فطری زندگی اپنانی چاہیے اور وہ معاشرے میں خواہ کتنے ہی بلند مقام تک کیوں نہ پہنچ جائیں اس سادگی کو ترک نہ کریں۔"

۹- اہلِ ثروت و اقتدار کے ساتھ تعلقات کا معیار

داعی اور مرشد کو دعوت و تبلیغ کے علاوہ کسی اور غرض سے مقتدر حلقوں اور ہائی سوسائٹی کے لوگوں سے گہرے تعلقات قائم نہیں کرنے چاہئیں۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: "میری امت کے بدترین لوگ وہ علماء ہیں، جو حکام کے در پر آتے ہیں اور بہترین حکام وہ ہیں، جو علماء کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔"(1)

دعوت و تبلیغ سے وابستہ لوگ کسی کے زیر بار احسان نہیں رہتے۔ انسان احسان کا بندہ ہے۔ جن لوگوں کا مقصد مال داروں کے دسترخوانوں پر شکم پروری کرنا، حکام کے در سے وابستہ رہنا اور ان کی چاپلوسی کرنا ہوتا ہے ان کی گفتگو میں تاثیر نہیں رہتی، لیکن اگر حکام اور اصحابِ ثروت لوگ مرشد اور مبلغ حضرات کی خدمت میں حاضر ہوں تو یہ قابلِ تحسین بات ہے، بشرطیکہ اس سے کوئی دنیوی غرض مقصود نہ ہو، کیونکہ حقیقی مرشد ہی ان کے دلوں میں فکرِ آخرت کا احساس پیدا کر سکتا ہے۔ فکرِ آخرت کی بادِ نسیم کے یہ جھونکے تجارتی، معاشرتی اور انتظامی سرگرمیوں کے باعث ان کے پژمردہ دلوں کے لئے حیاتِ تازہ اور راحت کا سامان فراہم کریں گے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ متعدد علماء کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور باوجود اس کے کہ آپ ان سے بڑھ کر زاہد تھے، ان سے مشاورت میں عار محسوس نہیں کیا کرتے

---

(1) العجلوني: كشف الخفاء، ٤٦٢٧/٢؛ الديلمي: الفردوس، ١٥٥/١

Marfat.com

تھے۔انہی بزرگوں میں سے ایک رجاء بن حیوہ بھی تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز بنفسِ نفیس علماء کی مجالس میں شرکت کیا کرتے تھے۔آپ عبیداللہ بن عبداللہ کی خدمت میں ایک گھڑی گزارنے کو اپنی ساری عمر سے زیادہ قیمتی جانتے تھے۔آپ ان کے حیات بخش مواعظ کو بڑے غور سے سنتے اوران سے استفادہ کرنے کی کوشش کرتے، حالانکہ آپ خود علم کا سمندر تھے اوراس لائق تھے کہ لوگ استفادہ کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ درحقیقت حضرت عمر بن عبدالعزیز کو یہ مقام انہی خوبیوں کی بدولت حاصل ہوا، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ڈھائی سالہ دورِ خلافت میں وہ کام کر گئے، جن کے لئے نصف صدی درکار تھی۔

اس کے باوجود بعض لوگ دعوت وتبلیغ کی غرض سے حکام کے پاس جانے کو اچھا سمجھتے ہیں، لیکن تجربے سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ وہ حکام کو تو کیا ہدایت دیتے خود ستی کا شکار ہو کر اپنی صلاحیتیں برباد کر بیٹھے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف پڑھے لکھے اور ہائی سوسائٹی کے لوگوں تک اپنی دعوت کو محدود رکھنا رسول اللہ ﷺ کی سنت کے خلاف ہے۔ایسا صرف ضرورت کے مواقع پر کیا جاسکتا ہے۔اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ فاصلہ برقرار رہے نیز مقصد بھی فوت نہ ہو۔

مکہ مکرمہ میں جب سردارانِ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے لئے خصوصی وقت اورنشست کا مطالبہ کیا جس میں عمارؓ، بلالؓ اور صہیبؓ جیسے لوگ حاضر نہ ہوں تو اس پر تنبیہ اور اس قسم کے مطالبات کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کرنے کے لئے درج ذیل آیات مبارکہ نازل ہوئیں:

”وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْهُمْ تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰهُ وَ کَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔“ [الکہف:۲۸]

”اور جو لوگ صبح وشام اپنے پروردگار کو پکارتے اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں ان کے ساتھ صبر کرتے رہو اور تمہاری نگاہیں ان میں سے (گزر

Marfat.com

کر اور طرف) نہ دوڑیں کہ تم آرائشِ زندگانی دنیا کے خواستگار ہو جاؤ اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اس کا کام حد سے بڑھ گیا ہے اس کا کہا نہ ماننا۔"

درحقیقت حضور اکرم ﷺ کے مزاج عالی کے لئے اس قسم کی تجویز کو قبول کرنا ممکن نہ تھا۔ آیت مبارکہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دعوت کا موجودہ انداز ہی مطلوب ہے۔ آپ ﷺ کو اس انداز کو جاری رکھنے کا کہا گیا ہے، ورنہ نبی کریم ﷺ کا اس درخواست کو قبول کرنے کی طرف میلان ہوا ہی نہیں تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ ہمارے رہبر ہیں۔ آپ ﷺ کا اسوہ ہمارے لئے سب سے بڑا معیار ہے۔ قرآن کریم سے ہمیں دعوت و تبلیغ کے اصول ملتے ہیں، جن میں سے ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ مالدار اور معاشرے کے ذمہ دار حضرات کو دعوت دینے کے ساتھ ساتھ ان سے استغناء برتا جائے اور ان پر رشک نہ کیا جائے۔ دورِ حاضر میں اس قسم کے مرشد کامل جانا بہت بڑی نعمت ہے۔

۱۰- مستقل مزاجی

دعوت کے کام پر اصرار اور پابندی رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہی مبلغ کے اخلاص کی علامت اور مخاطبین کے دلوں پر اثر انداز ہونے کا راز ہے، نیز یہ داعی کے اپنے مشن میں سنجیدہ اور اس کی عظمت کے قائل ہونے کی دلیل بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان سے چاہتے ہیں کہ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہ کا کلمہ اس کے دل میں راسخ ہو جائے اور اس کی اہمیت پوری طرح اس کے دل میں جاگزیں ہو جائے۔ حقیقی مرشد کی زندگی اللہ کی نظر میں پسندیدہ کاموں کے لئے وقف ہوتی ہے۔ لوگوں کے دلوں میں کلمہ توحید جاگزیں کرنا اس کا مطمحِ نظر ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کی ترجیحات اللہ کی پسند سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ داعی کے اصرار اور استقلال کی یہی تعبیر ہے۔

Marfat.com

دل میں تقویٰ کی موجودگی کی علامت یہ ہے کہ جو باتیں اللہ کی نظر میں اہمیت کی حامل ہیں انسان بھی انہیں عظمت کی نگاہ سے دیکھے۔ درج ذیل آیت مبارکہ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

"ذٰلِكَ وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ."

[الحج: ۳۲]

"یہ (ہمارا حکم ہے) اور جو شخص ادب کی چیزوں کی جو خدا نے مقرر کی ہیں عظمت رکھے تو یہ (فعل) دلوں کی پرہیزگاری میں سے ہے۔"

رسول اکرم ﷺ اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو خدا کی نظر میں پرعظمت کلمہ توحید کی برابر تلقین کرتے رہتے تھے۔ مثلاً آپ ﷺ ان سے کہتے: "جو شخص بھی لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرے گا وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔"(۱) حضرت خالد بن ولید ابھی نئے نئے ہی مسلمان ہوئے تھے کہ رسول اکرم ﷺ نے ان کے ہاتھ سے ہونے والی فتوحات کی خوشخبری دیتے ہوئے انہیں سیف اللہ کا لقب عطا فرمایا، لیکن جب ایک لڑائی میں کسی سبب سے ان کے ہاتھ سے ایک ایسا شخص قتل ہو گیا جو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا اقرار کر چکا تھا تو آپ ﷺ کو خالد بن ولید کے اس فعل سے اس قدر تکلیف ہوئی کہ آپ ﷺ نے خالد بن ولید کے اس فعل سے براءت کا اظہار فرمایا۔(۲)

مجھے آج تک وہ بات نہیں بھولتی جو جہاد کے ایک دعوے دار نے مجھ سے کہی تھی۔ اس کے الفاظ کو ذرا غور سے سنیے: "کیا تم جانتے ہو کہ جب بھی اسلام کو غلبہ حاصل ہوگا تو سب سے پہلے اُن مساکین کی گردنیں اڑائی جائیں گی جن سے مسجدیں بھری پڑی ہیں۔" ایسی گمراہ

---

(۱) مسلم: الایمان، ۵۲؛ الترمذی: الایمان، ۱۷؛ الهیثمی: مجمع الزوائد، ۱/۱۸

(۲) البخاری: الاحکام، ۳۵، الجزیة، ۱۱؛ النسائی: القضاة، ۱۷؛ المسند: ۲/۱۵۱

Marfat.com

ہیں۔" ایسی گمراہ کن بات سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، حالانکہ وہ اپنے خیال میں اسلام کی حمایت میں گفتگو کر رہا تھا۔

مبلغ اللہ کی نظر میں پسندیدہ امور پر اصرار اور استقلال کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہی اس کے اخلاص اور دعوت کے لئے مر مٹنے کے جذبے کو پرکھنے کا معیار ہے۔ جو شخص دعوت و تبلیغ کے لئے اپنی تمام عمر وقف نہیں کر سکتا وہ حقیقی مرشد تو کجا محض مرشد کہلانے کے بھی قابل نہیں ہے۔ حقیقی مرشد تو سو بار دعوت دیتا ہے۔ اس کے بعد بھی کوئی اس کی بات نہ سنے تو ہمت نہیں ہارتا، بلکہ تمام عمر اسی کام میں لگا دیتا ہے۔ وہ اس گھڑی کے انتظار میں رہتا ہے کہ کب دعوت کی شرائط پوری ہوں اور مخاطب کا دل اس کی بات کو قبول کر لے۔ وہ کبھی رنجیدہ اور کبیدہ خاطر نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے انبیائے کرام کا اسوہ ہوتا ہے، جنہوں نے ساری عمر اصرار، صبر اور استقلال کے ساتھ گزار دی، لیکن حق بات لوگوں تک پہنچانے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔

حبیب کبریاء رسول اکرم ﷺ کی زندگی کے تیئس سال دعوت و تبلیغ میں گزر گئے۔ آپ ﷺ کو دعوت و ارشاد سے کبھی فرصت نہیں ملی، بلکہ مسلسل دعوت و تبلیغ میں لگے رہے۔ خدا جانتا ہے کہ آپ ﷺ نے ابو جہل اور سردارانِ قریش کو کتنی مرتبہ ایمان کی دعوت دی ہوگی؟ آپ اس مقصد کے لئے ان کی ضیافتیں کیا کرتے اور جب بھی موقع ملتا انہیں ایمان کی طرف بلاتے۔

صحابہ کرام کا بھی یہی مزاج تھا حتی کہ دعوت پر اصرار اور مواظبت ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی، ان کے بعد بھی امت کی عظیم ہستیوں نے دعوت و ارشاد پر اصرار اور مواظبت کو اپنا شعار بنائے رکھا۔

داعی کو جب اپنی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے تو اس کا قدرتی نتیجہ اصرار اور مواظبت کی صورت میں نکلتا ہے۔ داعی کو اس بات کا ادراک ہونا چاہیے کہ تبلیغ دین کی بنیاد ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خدا کے سامنے حق کی عدم توقیر اور مخلوق کے سامنے کتمانِ حق کا ارتکاب کر بیٹھے۔ اسے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ لوگوں کو ہدایت دینا نہ تو کسی انسان کے بس میں ہے اور نہ یہ اس کی تبلیغی ذمہ داریوں

Marfat.com

میں شامل ہے۔ لوگ ہدایت پائیں یا نہ پائیں اسے ثواب ہر صورت میں ملے گا۔ ایک اور پہلو سے دیکھیں تو داعی کی تبلیغ پر مواظبت اور ہمیشہ اس کی فکر میں مستغرق رہنا ان حقائق کی مقبولیت کا خفیہ ثبوت ہیں، جن کی طرف وہ دعوت دیتا ہے، نیز صرف حق تعالیٰ سے نتائج کا امیدوار رہنا اخلاص کی دلیل ہے، جو تمام عبادات کا نچوڑ اور دینی زندگی کی روح ہے۔

۱۱- بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قوانینِ فطرت کی مخالفت سے اجتناب

مبلغ کبھی بھی قوانین فطرت سے ٹکراؤ کی صورت پیدا نہیں کرتا، بلکہ اپنی تمام تبلیغی سرگرمیاں بصیرت سے سرانجام دیتا ہے۔ فطرت تکوینی قوانین پر مبنی ہوتی ہے، لہٰذا دین کے احکام کی دعوت ان قوانین کے مطابق دینی چاہیے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ انسانی فطرت کی خصوصیات اور امتیازات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مخاطب سے گفتگو کی جائے۔ بصورتِ دیگر گفتگو کتنی ہی دلکش اور عمدہ کیوں نہ ہو مخاطب اس کی طرف توجہ نہیں دیتا، کیونکہ کبھی تو وہ گفتگو اس کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے اور کبھی وہ اسے فرضی خام خیالی سمجھتا ہے۔ اس پہلو پر کچھ مزید روشنی ڈالنا شاید فائدے سے خالی نہ ہو۔

مثلاً ہر انسان کے دل میں محبت کا جذبہ ہوتا ہے، لہٰذا اس جذبے کی رعایت نہ کرنا یا اس کے وجود سے انکار کرنا مناسب نہیں، اس لئے لوگوں سے یوں نہیں کہنا چاہیے کہ محبت نہ کرو۔ اس قسم کے مطالبے کا فطرت سے ٹکراؤ کے سوا کچھ فائدہ نہیں۔ مبلغ کو چاہیے کہ مخاطب میں موجود جذبہ محبت کو درست سمت پر ڈالے اور اسے سمجھائے کہ فنا ہو جانے والی محبوباؤں سے اظہار محبت کی بجائے اس ذات سے محبت کرنی چاہیے جو محبت کی مستحق ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ خدا کی محبت فانی محبوباؤں کو دینا ایک آفت و مصیبت ہے، جبکہ خدا سے محبت کرنا رفعِ درجات کا سبب ہے۔ خلاصہ یہ کہ مبلغ کو چاہیے کہ مخاطب کو یہ کہنے کی بجائے کہ محبت نہ کرو یوں کہے کہ سرمدی اور ابدی خدا سے محبت

Marfat.com

کرو یا یوں کہے کہ جس سے محبت کرو خدا کے لئے کرو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کسی بھی مخلوق کی محبت ناجائز نہیں قرار پائے گی۔ چنانچہ شاعر یونس امرہ کہتا ہے:

"أُحِبّوا المَخلُوقَاتِ لِأَجلِ خَالِقِهَا"

"مخلوق سے اس کے خالق کی خاطر محبت کرو۔"

یہی کیفیت ہر انسان میں پائی جانے والی صفت عناد کی ہے۔ اس کی بدولت بعض لوگ وحشی جانوروں کی طرح آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔ دورِ حاضر میں جھگڑوں اور بدامنی کے پس یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ جب یہ جذبہ غالب آجائے تو تمام معاملات میں گرمی، غصہ اور شدت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن اگر اس جذبے سے چھٹکارا پا لیا جائے تو معتدل اور میانہ رو کردار سامنے آتا ہے۔ اگرچہ بظاہر اس جذبے میں بہت سے منفی پہلو پائے جاتے ہیں، لیکن خاص مقصد اور حکمت کے پیش نظر اسے جذبہ انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر عناد حق بات پر ثابت قدم رہنے کے لئے بہت زیادہ توانائی فراہم کرتا ہے۔ اگر جذبہ عناد کارفرما نہ ہوتا تو تھوڑے سے دباؤ کے نتیجے میں انسان درست موقف سے پیچھے ہٹ جاتا۔ حاصل یہ ہے کہ اس جذبے کو درست رخ پر ڈال کر ہم بہت سے اچھے نتائج برآمد کر سکتے ہیں، اس لئے ہمیں لوگوں سے یوں نہیں کہنا چاہیے کہ عناد چھوڑ دو، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ "جذبہ عناد کو حق اور درست موقف پر ثابت قدم رہنے کے لئے استعمال کرو۔" دعوت کا یہ اسلوب زیادہ مفید اور محفوظ ثابت ہو سکتا ہے۔

اسی طرح انسان میں 'سدا رہنے' کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے، حالانکہ انسان کا مادی ڈھانچہ سدا رہنے والا نہیں، بلکہ اس کی ایک ابتداء اور انتہا ہے۔ زندگی کی ابتداء ماں کے رحم میں بیضہ کے بارآور ہونے سے ہوتی ہے، لیکن باوجود اس کے کہ انسان اپنے ابتدائی ایام سے ہی موت کی خبریں سنتا رہتا ہے وہ اس جذبے سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ جذبہ کسی اعلیٰ مقصد کی خاطر انسان کی فطرت میں رکھا گیا ہے۔ وہ مقصد یقیناً ہمیشہ کی زندگی میں کامیابی ہے۔

Marfat.com

لہٰذا انسان کو چاہیے کہ اس خداداد جذبے کو صحیح جگہ یعنی جنت اور دیدارِ خداوندی کے حصول کے لئے استعمال کرے۔ بصورتِ دیگر یہ جذبہ یاس وناامیدی میں تبدیل ہوکر اس کے لئے وبالِ جان بن جائے گا، جس کے نتیجے میں اس کی زندگی میں اعتدال وتوازن برقرار رہے گا اور نہ چین وسکون۔

انسان میں حبِ جاہ اور مسلسل ترقی کرتے رہنے اور اپنے تمام اہداف کو پالینے کی خواہش بھی ہوتی ہے۔ بہت سے کمزور شخصیت کے لوگوں کے لئے اس جذبے پر قابو پانا ممکن نہیں ہوتا۔ لہٰذا مرشد کو انسان میں موجود اس جذبے کا ادراک کرتے ہوئے اس کا رُخ اعلیٰ مقاصد کی طرف پھیر دینا چاہیے۔ بصورتِ دیگر اس کی گفتگو کا مخاطب پر الٹا اثر ہوگا۔ انسان کو یہ جذبہ جنت کے اعلیٰ درجات کی خاطر تگ ودو کرنے کے لئے دیا گیا ہے، نیز اس جذبے کے تحت انسان اپنے اندر اچھے اوصاف اور اعلیٰ صلاحیتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اس قسم کے جذبات کا ادراک، اظہار اور پھر اچھے مقاصد کے لئے استعمال کا انحصار مرشد کے فہم وبصیرت پر ہوتا ہے۔

مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلنا اس راستے کے راہیوں کا مقدر ہے لہٰذا انبیائے کرام، صدیقین، شہداء اور حقیقی مرشدین کی طرح مرشد اور داعی کو بھی ہر قسم کی قربانی پیش کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ خدائی دعوت کے پاکیزہ حاملین کو انہی ہستیوں کے نقشِ قدم پر چلنا اور انہی کی سوچ کا حامل ہونا ضروری ہے۔ اس راستے سے انحراف اپنی منزل اور ہدف سے دور ہونے کے مترادف ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ منزل سے بھٹکا ہوا شخص مبلغ نہیں کہلا سکتا۔

حضرت نوح علیہ السلام نے عرصہ دراز تک مشقتیں جھیلیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دعوت کی خاطر جلاوطن ہونا پڑا۔ اس راہ میں انھیں آتشِ نمرود میں جھونکا دیا کوئی ایسی تکلیف نہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی طرف سے نہ اٹھائی ہو۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بدن کے دو ٹکڑے کردیئے گئے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ نہیں دیکھی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعوت بڑا مشکل اور بھاری کام ہے، جو بڑے حوصلے اور عزم کا متقاضی ہے۔ جو لوگ تقدیر کے اس فیصلے پر راضی نہیں یا اس راستے کی تکلیفوں کو بخوشی برداشت کرنے کے

Marfat.com

لئے تیار نہیں وہ انبیائے کرام علیہم اسلام کے نقش قدم پر نہیں چل سکتے۔دورانِ سفر ان کی طاقت جواب دے جاتی ہے اور وہ ہمت ہار کر انبیائے کرام کے قافلے سے بچھڑ جاتے ہیں۔

حارث بن حارث کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اپنے باپ کے ساتھ منیٰ میں تھا کہ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک جگہ جمع ہیں۔میں نے اپنے والد سے پوچھا: ''یہ ہجوم کیسا ہے؟'' والد نے کہا: ''یہ لوگ ایک بددین کے گرد جمع ہیں'' کچھ دیر بعد میں کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اکرم ﷺ لوگوں کو خدا پر ایمان لانے کی دعوت دے رہے ہیں، لیکن لوگ آپ ﷺ کو ایذاء پہنچا رہے ہیں۔جب آفتاب خوب بلند ہو گیا تو لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے اور ایک عورت ایک پیالہ اور ایک رومال لے کر آئی۔اس کا گریبان کھلا ہوا تھا اور وہ رو رہی تھی۔آپ ﷺ نے پیالہ لیا۔اس سے پانی پیا اور وضو فرمایا پھر اس عورت کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ''میری پیاری بیٹی اپنے گلے کو دوپٹے سے ڈھانپ لے اور اپنے باپ کی ذلت یا اس کے مغلوب ہونے کا اندیشہ نہ کر۔'' میں نے پوچھا: ''یہ خاتون کون ہے؟'' لوگوں نے بتایا: ''یہ اس کی بیٹی زینب ہے۔''(۱) اس قسم کے حوادث، جنہوں نے حارث بن حارث کے ذہن اور روح پر گہرے اثرات چھوڑے، نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی مکی زندگی کا نمایاں پہلو ہیں۔اس دور میں ان کی زندگی کا ہر دن ایسے ہی گزرتا تھا۔

ایک اور روز جب حضور اکرم ﷺ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، ابن ابی معیط نے پیچھے سے آ کر آپ کا گلا گھونٹنا شروع کر دیا۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ دوڑے آئے، حضور اکرم ﷺ کو اس بدبخت سے چھڑایا اور کہا: ''کیا تم ایسے شخص کو جان سے مار ڈالنا چاہتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے؟'' کتنی ہی بار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کے پیٹنے کی وجہ سے بے ہوش ہو کر مکہ کی گلیوں میں گر پڑتے۔ایک دفعہ عتبہ بن ربیعہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

(۱) ابن الاثیر: اسد الغابة، ۱/۴۳۶؛ ابن حجر: الاصابة، ۱/۲۷۵؛ ابن عبد البر: الاستیعاب، ۱/۳۴۹

Marfat.com

کے چہرے پر جوتوں کی بارش کردی یہاں تک کہ آپؓ کو پہنچانا مشکل ہوگیا پھر اسی پر بس نہیں کی، بلکہ آپ کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ بنو تمیم کو پتہ چلا تو وہ آپؓ کو ایک کپڑے میں اٹھا کر لے گئے۔ انہیں آپؓ کے بچنے کی ذرا بھی امید نہ تھی؟ لیکن شام کو آپؓ کو ہوش آیا تو پہلی بات یہ کی، کہ رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟(۱)

عمارؓ، ان کے والد یاسرؓ اور ان کی والدہ سمیہؓ کے جسموں کو ایک دوسرے کے سامنے داغا جاتا۔ ان کی یہ قربانیاں اسلامی تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف سے ہمیشہ لکھی جاتی رہیں گی۔(۲) حضرت بلالؓ پتھر کی چٹان کے نیچے "أَحَــدٌ أَحَــدٌ" کی صدا لگاتے تو دراصل یہ رسول اللہ ﷺ کے مؤذن کے طور پر ان کے انتخاب کا امتحان تھا۔(۳) طلحہ بن عبید اللہؓ کی والدہ انہیں زنجیروں باندھ کر مکہ کی گلیوں میں پھراتیں۔(۴) زبیرؓ بن عوام کو جلتی ہوئی چٹائی میں لپیٹ دیا جاتا۔(۵) اس طرح انہوں نے قربانیوں سے بھرپور تاریخ رقم کی۔

صحابہ کرام کی قربانیوں کی ایک اور تصویر ذرا ملاحظہ فرمایئے: حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ رومیوں کے ہاتھوں قید ہوگئے، کئی دنوں تک مختلف قسم کی تکلیفیں پہنچانے کے بعد رومیوں کے بادشاہ نے انہیں تجویز پیش کی کہ اگر وہ عیسائیت قبول کرلیں تو انہیں حکومت میں شامل کرلیا جائے گا۔ آپؓ نے صاف انکار کردیا۔ بادشاہ نے آپؓ کو سولی پر چڑھانے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی۔ اور آپ پر تیر برسائے گئے لیکن آپؓ نے کوئی واویلا نہیں کیا۔ اس کے بعد آپؓ کو سولی پر سے اتار دیا گیا، اور ایک دیگ میں پانی ڈال کر گرم کیا گیا یہاں تک کہ وہ کھولنے

---

(۱) ابن الكثير: البداية، ۲۹/۳

(۲) دیکھئے: ابن هشام: السيرة، ۳۴۲/۱؛ ابن سعد: الطبقات، ۳/۲۴۶-۲۴۸

(۳) دیکھئے: ابن هشام: السيرة، ۳۴۲/۱

(۴) دیکھئے: ابن هشام: ۳۳۹/۱-۳۴۰؛ ابن حجر: الاصابة، ۴۱۰/۳

(۵) ابن حجر: الاصابة، ۵۴۵/۱؛ الهيثمي: مجمع الزوائد، ۱۵۱/۹

Marfat.com

لگا۔ایک قیدی سپاہی کو اس میں ڈال دیا گیا جو فوراً جل کر کوئلہ ہو گیا۔اس کے بعد حضرت حذیفہؓ کو کہا گیا کہ اگر انہوں نے عیسائیت قبول نہ کی تو انہیں بھی کھولتی ہوئی دیگ میں ڈال دیا جائے گا۔جب انہیں دیگ کے قریب لایا گیا تو وہ رونے لگے۔بادشاہ نے انہیں واپس بلایا اور پوچھا کہ وہ روئے کیوں ہیں؟ آپؓ نے جواب دیا کہ میری خواہش ہے کہ کاش! میرے پاس سو جانیں ہوتیں اور میں انہیں اسی طرح اللہ کی راہ میں قربان کر دیتا۔بادشاہ کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی۔اس نے حضرت عبداللہ بن حذافہؓ سے کہا کہ اگر تم میرے سر کا بوسہ لے لو تو میں تمہیں رہا کر دوں گا۔حضرت عبداللہ بن حذافہؓ نے کہا کہ اگر تمام مسلمان قیدیوں کو رہا کر دو تو مجھے قبول ہے۔بادشاہ نے کہا: ''ٹھیک ہے۔'' آپؓ نے اس کے سر کا بوسہ لیا۔بادشاہ نے آپؓ کو تمام مسلمان قیدیوں کے ہمراہ رہا کر دیا۔آپ مسلمان قیدیوں کو لے کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت عمرؓ نے اٹھ کر آپؓ کے سر کا بوسہ لیا۔(1) (یہ ایک روایت کے الفاظ ہیں۔)ایک دوسری روایت میں آخری لمحات کی ایک دوسرے انداز میں منظر کشی کی گئی ہے۔جب حضرت عبداللہ بن حذافہؓ مضبوط قدموں کے ساتھ چہرے پر مسکراہٹ لئے تختہ دار کی طرف بڑھے تو ایک پادری نے وہاں موجود فوجیوں سے تھوڑی دیر کے لئے عبداللہ بن حذافہؓ سے گفتگو کرنے کی اجازت چاہی اور پھر ان کی طرف متوجہ ہو کر ان سے کہا: ''میرے بیٹے! دیکھ چند لمحوں کے بعد تیری زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہے۔تیرے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے میں نے چند منٹوں کی مہلت مانگی ہے۔اس دوران اگر میں تمہیں عیسائیت کی حقانیت کا قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو زندگی سے محروم ہو جانے کے باوجود تم آخرت میں سرخرو ہو جاؤ گے نیز ہو سکتا ہے کہ بادشاہ تمہارے اس اقدام سے خوش ہو کر تمہاری جان بخشی بھی کر دے۔'' حضرت عبداللہ بن حذافہؓ نے انتہائی سنجیدگی اور وقار سے جواب دیتے ہوئے کہا: ''پادری صاحب! مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ دیتا تو میں آپ کی دست بوسی کرتا کہ آپ نے میری بہت بڑی مشکل آسان کر دی۔کسی کو اسلام کی دعوت دیئے بغیر اس دنیا سے جانا مجھ پر بہت گراں گزر رہا تھا، لیکن

(1) ابن حجر: الاصابة، ۲/۲۹۶، ۲۹۷؛ ابن الاثیر: الاسد الغابة، ۳/۲۱۲

Marfat.com

آپ کی وجہ سے مجھے یہ موقع مل گیا۔ اگر ان چند لمحات میں میں آپ کو اسلام کی حقانیت کا قائل کرلوں تو مجھے موت کا کوئی غم نہیں رہے گا۔ ممکن ہے کہ یہ تمہاری اخروی زندگی میں نجات کا باعث بن جائے۔"

یہ گفتگو سن کر ارد گرد کے لوگوں کے منہ حیرت کے مارے کھلے کے کھلے رہ گئے، کیونکہ اس لئے کہ وہ اس صحابی کے نزدیک دعوت کی اہمیت سمجھنے سے قاصر تھے۔ مبلغ کے دل میں تبلیغ کی آگ ہمیشہ روشن رہنی چاہیے، جو مبلغ کی آتش شوق کو بھڑکاتی اور ارد گرد کے ماحول کو منور کرتی ہے۔ دعوت، داعی کا مقصدِ زندگی ہوتا ہے۔ کامیابی و کامرانی کا واحد راستہ مشقت اور مجاہدہ ہے۔ اضطراری مجاہدہ ختم ہو جاتا ہے تو اختیاری مجاہدہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ مدینہ منورہ میں اختیاری مجاہدہ کرتے تھے۔ باوجود اس کے کہ بیت المال، مال و دولت سے بھرا رہتا تھا، لیکن کئی کئی ہفتے آپ ﷺ پیٹ بھر کر کھانا نہ کھاتے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن میں حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول ﷺ! "آپ ﷺ کو کیا ہوا؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "بھوک نے نڈھال کر دیا ہے۔" یہ سن کر مجھ پر گریہ طاری ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "غم نہ کھا۔ اگر بھوکا شخص دنیا میں ثواب کی نیت سے صبر کرے تو آخرت کی ہولناکیوں سے محفوظ رہے گا۔"(1)

اسلام کی بنیاد زندگی کے اِن اصولوں پر ہے۔ جس طرح اِن اصولوں کی بدولت اسلام کی حکمرانی لوگوں کے دلوں پر قائم ہوئی ہے اسی طرح اس کی حکمرانی ایسی ہی روحانی کیفیات کے حامل مجاہدین کے ہاتھوں ظاہر میں بھی عمل میں آئے گی۔ اسلام کا قیام لکھاریوں، بیوروکریسی اور مشقت اور صعوبت سے ناآشنا لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ حضرت لقمان حکیم کی اُن نصیحتوں میں یہ حقیقت واضح طور پر نظر آتی ہے، جو انہوں نے اپنے بیٹے، بلکہ زیادہ درست الفاظ میں اس نوجوان نسل کو کی تھی جو کسی بھی دعوت کی سب سے اہم مخاطب ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے ان نصیحتوں کو ذکر کرکے انہیں ایک دائمی دستور العمل کی حیثیت دے دی ہے:

(1) ابو نعیم: الحلیة، ۷/۱۰۹

Marfat.com

”یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ.“

[لقمان:١٧]

”بیٹا! نماز کی پابندی رکھنا اور (لوگوں کو) اچھے کاموں کے کرنے کا امر اور بری باتوں سے منع کرتے رہنا اور جو مصیبت تجھ پر واقع ہو اس پر صبر کرنا۔ بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔“

یعنی جو شخص نماز قائم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے، اسے تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، گویا یہ ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ ان میں سے کسی ایک پر عمل پیرا ہونا اس حقیقت کے ایک پہلو پر عمل پیرا ہونے کے مترادف ہے، جبکہ دونوں پر عمل کرنا دونوں پہلوؤں پر عمل پیرا ہونا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا زیادہ قرب نصیب ہوگا۔

دراصل حقیقت کے تین پہلو ہیں اور انسان کے کمال کا مدار ان تینوں پہلوؤں پر عمل پیرا ہونے پر ہے۔ میرے نزدیک عظیم شخصیات کا یہی طرزِ عمل رہا ہے، لہٰذا انبیائے کرام کی دعوت کا بوجھ اٹھانے والوں کو بھی اسی راستے پر چلنا ہوگا۔ دوسروں کے طور طریقے تو محض مہم جوئی ہیں۔ داعی کو اس قسم کی سرگرمیوں میں پڑنے سے پناہ مانگتے رہنا چاہیے۔

سطور بالا میں ہم نے قوانین فطرت سے عدم تصادم اور دعوت وارشاد کے کام کو فراست اور بصیرت کے ساتھ سرانجام دینے کے بارے میں جو اصول بیان کئے ہیں، دعوت کے میدان میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔

اس بارے میں ہمارے لئے بہترین اسوہ رسول کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہے۔ آپ ﷺ کی نبوت کی خصوصیت کا ہمارے موضوع یعنی ہر انسان سے اس کی صلاحیتوں کی مناسبت سے کام لینے سے گہرا تعلق ہے۔ یہ آپ ﷺ کی فراست اور مردم شناسی کی دلیل ہے۔ آپ ﷺ نے کسی شخص

Marfat.com

کوکوئی ذمہ داری سونپ کراس سے واپس نہیں لی، جو آپ ﷺ کی نبوت کی واضح دلیل ہے۔
مثلاً آپ ﷺ نے حضرت حسان بن ثابت کو کفار کی ہجو کرنے کی ذمہ داری سونپی تھی۔(۱) آپ کے اشعار کا ایک ایک بیت دشمنانِ اسلام کے دلوں میں زہر آلود تیر کی طرح لگتا تھا، لیکن اگر کسی میدانِ جنگ کی قیادت ان کے سپرد کر دی جاتی تو ان کو اپنے مخصوص دائرہ کار میں حاصل ہونے والی فتوحات کی بجائے سخت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑتا۔

مصعب بن عمیر، معاذ بن جبل اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم وغیرہ جن صحابہ کرام کو رسول اکرم ﷺ نے دعوت وارشاد کے لئے مختلف علاقوں میں بھیجا تھا ان میں دعوتی کام کے لئے غیر معمولی صلاحیتیں موجود تھیں۔ اگر یہ کام حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سونپ دیا جاتا تو چونکہ انہیں میدانِ جنگ کے بڑے بڑے بہادروں اور شاہسواروں کے دلوں میں خوف ڈالنے کے لئے پیدا کیا گیا تھا، اس لئے شاید وہ اِس کام کو خوش اسلوبی سے انجام نہ دے پاتے، اس لئے حضور ﷺ نے اسی میدان میں ان کی صلاحیتوں سے کام لیا۔ ''افراد سے ان کی صلاحیتوں کے مطابق خدمت لینا مرشد کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ اس کا تعلق انتہائی قریب سے انسانی مشاہدے کے ساتھ ہے۔ جو لوگ انسان کی فطرت کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو جاننے کے باوجود ان کے مطابق منصوبہ سازی نہیں کرتے ان کی کامیابی ہمیشہ مشکوک رہتی ہے۔''

نیز جب تک ہر فرد سے اس کی صلاحیتوں کے مطابق کام نہ لیا جائے اس وقت تک افراط وتفریط کو روکنا ممکن نہیں۔ صرف حقیقی مرشد ہی اس کا سد باب کر سکتا ہے اور فطرت کے مطابق اپنے نظام کو ڈھال کر مشکل سے مشکل کام کو انتہائی کم مدت میں پایہ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔

(۱) دیکھئے: مسلم: فضائل الصحابة، ۱۵۱-۱۵۶

Marfat.com

تیسری فصل

مبلغ تحریر کے آئینے میں

۱- شفقت

۲- ایثار و قربانی

۳- دعا و مناجات

۴- منطقی طرز استدلال اور واقعیت پسندی

۵- عفو و درگزر

۶- حساس مزاجی

۷- روحانی گہرائی

۸- شوق و اشتیاق

۹- دل کی پاکیزگی اور روحانی لطافت

Marfat.com

Marfat.com

اس فصل میں ہم اہل دعوت کے طریقِ کار کی ایک اور پہلو سے وضاحت کے لئے دوسری فصل سے قدرے مختلف انداز میں کچھ امور پر مثالوں کے ساتھ روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ منفرد عنوانات پر مشتمل اِس فصل کو نفس انسانی کے ساتھ خطاب بھی قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ اِس کا تعلق مبلغ کی روح کی تشکیل سے ہے۔

۱- شفقت

مبلغ ہمیشہ شفقت و رحمت کا پیکر ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کو حق بات کا قائل کرنے کے لئے غلط ذرائع مثلاً طاقت، سختی اور زبردستی کا استعمال نہیں کرتا، کیونکہ ایمان باللہ کو ان ذرائع کے ذریعے کبھی بھی دلوں میں جاگزیں نہیں کیا جاسکتا، بلکہ شفقت کے ذریعے دلوں اور ضمیر میں نرمی پیدا ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان سے مانوس ہو کر اسے قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

مبلغ اپنے مخاطب سے دلائل کے ذریعے بات منواتا ہے۔ وہ علم کے زور پر اسے قائل کرتا ہے اور اپنے عمدہ کردار کے ذریعے اسے متاثر کرتا ہے۔ ہر کوئی مبلغ کو ایک اچھے کردار کی حامل شخصیت کے طور پر جانتا اور پہچانتا ہے۔ یہ خصوصیت مبلغ کے کلام میں بے پناہ تاثیر پیدا کر دیتی ہے، لیکن جن لوگوں کے دل خوف سے کانپ رہے ہوں وہ ایسے مبلغ کی شخصیت سے بھی خوف کھانے لگتے ہیں جو ظلم و استبداد کی فضا میں اپنی بات پیش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ اس کے پیش کردہ حقائق سے خائف ہو جاتے ہیں۔ حقائق خواہ کتنے ہی جاندار اور محبت سے بھرپور کیوں نہ ہوں مبلغ کی مردہ دلی کا اثر سامعین پر ضرور پڑتا ہے۔ اس طریقِ کار سے کبھی بھی اچھے نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی غلطیوں کے ذریعے لوگوں کو اسلام سے متنفر یا خائف کرے۔

دوسری خوبیوں کی طرح رسول اکرم ﷺ کے اخلاق کریمہ میں رحمت و شفقت بھی بدرجہ کمال موجود تھی۔ حضور اکرم ﷺ کی عظیم الشان دعوت کی بنیاد شفقت جیسے بیش بہا اخلاق پر قائم تھی،

Marfat.com

جسے آپ ﷺ نے محبت اور مہربانی سے معطر فضا میں امت کے سامنے پیش کیا۔ آپ ﷺ نے بجاطور پر فرمایا:

"اِنَّمَا اَنَا لَکُمْ مِثْلُ الْوَالِدِ"

"میں تمہارے لئے والد کی طرح ہوں۔"(۱)

اور ایسے کیوں نہ ہوتا آپ ﷺ تو ایسے مہربان اور رحیم والد ہیں، جنہوں نے اپنی پیدائش کے وقت بھی "اُمَّتِی اُمَّتِی" پکارا تھا۔ امت کے لئے "اَولادی" کے الفاظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ آپ کے دل میں امت کے لئے ایسے ہی جذبات موجزن تھے جیسے اپنے جگر گوشوں کے لئے ہوتے ہیں۔ یعقوب علیہ السلام کے تو چہیتے بیٹے یوسف علیہ السلام تھے مگر آپ ﷺ کی امت کا ہر فرد آپ ﷺ کے لئے یوسف کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ﷺ اپنی امت کے ہر ہر فرد کو اپنے سینے سے لگانے کے لئے ایسے ہی تیار ہیں جیسے مہربان باپ کو اپنے اکلوتے بیٹے کو سینے سے لگانے کا اشتیاق ہوتا ہے۔ دوسری طرف آپ ﷺ کی امت کا ہر ہر فرد بھی آپ ﷺ سے نہ صرف اپنے والدین بلکہ اپنی جان سے بھی بڑھ کر محبت کرتا ہے۔ شفقت اور مہربانی سے پھوٹنے والی محبت اور قابل احترام کردار مبلغ کی لازمی صفات ہیں۔ ان صفات کا ایک خصوصی امتیاز ہے، اس لئے جہاں شفقت اور نرمی نہ ہو وہاں محبت اور احترام بھی نہیں پایا جاتا۔ طاقت کے ذریعے لوگوں کو بعض باتوں میں اطاعت پر مجبور کیا جا سکتا ہے، لیکن جو حقائق آپ لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں آپ ان کی محبت لوگوں کے دلوں میں زبردستی نہیں اتار سکتے۔ شفقت اور رحمت کے لئے کوئی بات ناممکن نہیں۔ جہاں شفقت اور رحمت ناکام ہو جائے وہاں کوئی اور چیز کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اگر آپ لوگوں کو آپس میں محبت کی لڑی میں پرونا چاہتے ہیں تو پہلے ان کے دلوں کو شفقت اور رحمت سے زیر کریں۔ جب تک آپ لوگوں کی غلطیوں اور لغزشوں سے درگزر نہیں کریں گے اور شفقت ومہربانی کے انداز میں حقائق ان کے سامنے پیش نہیں کریں گے اس وقت تک آپ لوگوں کے کسی انفرادی یا اجتماعی مسئلے کا پائیدار حل تلاش نہیں کر پائیں گے۔ ہمیں امت کی غلطیوں اور لغزشوں کے

(۱) ابو داؤد: الطہارۃ، ٤؛ النسائی: الطہارۃ، ۳۵

Marfat.com

بارے میں کیا موقف اختیار کرنا چاہیے، اسے نبی اکرم ﷺ نے مندرجہ ذیل مثال سے سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے: ''میری اور میری امت کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک شخص نے آگ جلائی، لیکن جانور اور پتنگے آ آ کر اس میں گرنے لگے۔ میں تمہیں تمہاری کمروں سے پکڑ پکڑ کر پیچھے ہٹا رہا ہوں، لیکن تم ہو کہ اس آگ میں گرنے کے لئے دوڑے جا رہے ہو۔''[1] حضور اکرم ﷺ نے اس مثال کے ذریعے دعوت و تبلیغ کے بارے ایک بہت اہم حقیقت کا اظہار فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ جو شخص دعوت و تبلیغ کے راستے پر چلتا ہے، وہ معاشرے کے ایک بہت بڑے حصے تک حق بات پہنچاتا ہے، جبکہ اس کے برعکس غلط افکار و نظریات لوگوں کو زوال بلکہ ہلاکت و بربادی کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔

آج کے انسان کے دل کو مہربانی و محبت کے ساتھ ذرا ٹٹول کر دیکھیں تو اس میں سے ایک غمگین صدا سنائی دے گی، کیونکہ گناہوں اور برائیوں کی دلدل میں پھنسا کوئی بھی شخص خوش و خرم نہیں رہ سکتا۔ اُن لوگوں کے سوا جن کے دل تاریک اور ضمیر مردہ ہو چکے ہوں اور روحانی نظام بالکل تباہ ہو گیا ہو، کوئی بھی انسان ایسی بری زندگی کو برضا و رغبت قبول نہیں کرتا، بلکہ وہ غلطی سے اس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر اسے اس سے نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ آپ اپنے محبت اور شفقت بھرے انداز میں اسے نجات کا وہ راستہ دکھا سکتے ہیں، جس کی اسے ایک عرصے سے تلاش ہے۔ یہ بات مشاہدے سے ثابت ہے کہ اگر آپ محبت کے جذبے کے ساتھ ایسے لوگوں کے پاس جائیں اور پیار و نرمی سے انہیں دین کی بات سمجھانے کی کوشش کریں تو آپ کے نہ چاہنے کے باوجود بھی وہ آپ اور آپ کی باتوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے ایسے لوگوں نے ایسے ایسے دور میں اسلام قبول کر لیا جس کی ہمیں ہرگز توقع نہ تھی۔ اس قسم کی ہزاروں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، چونکہ آپ ان کی ہدایت کا ذریعہ بنے ہیں، اس لئے کہ وہ تمام عمر آپ کے ممنون رہیں گے نیز وہ جو بھی نیک اعمال کریں گے ان کا ثواب آپ کے نامہ اعمال میں بھی لکھا جائے گا۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھیے:

(۱) مسلم: الفضائل، ۱۷۔۱۹؛ البخاری: الرقاق، ۲۶

Marfat.com

فرض کریں ایک گھر میں آگ لگی ہے، جس میں پورا خاندان موجود ہے، لیکن آپ اس خاندان کو ناپسند کرتے ہیں۔ یا ایک کشتی غرق ہو رہی ہے اور اس کے مسافر جنہیں آپ جانتے بھی نہیں سطح سمندر پر سامنے نظر آنے والی موت سے بچنے کے لئے مدد کے لئے پکار رہے ہیں تو ایسے موقع پر آپ کیا کریں گے؟ یقیناً آپ اس خاندان کو جسے آپ ناپسند کرتے ہیں آگ سے بچانے کے لئے اور ان مسافروں کو جنہیں آپ جانتے تک نہیں غرق ہونے سے بچانے کے لئے نہ صرف دوڑ پڑیں گے بلکہ اگر ضروری ہوا تو انہیں بچانے کے لئے اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈال دیں گے اور اگر اس دوران ان میں سے کسی نے آپ کی حوصلہ شکنی بھی کی تو آپ اس کی پرواہ نہ کریں گے، کیونکہ آپ کے ضمیر کی آواز ہر آواز پر غالب ہے، حالانکہ جن لوگوں کی آپ جان بچانا چاہتے ہیں ان کی عمر پچاس یا ساٹھ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس سے خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ لوگوں کی ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی بچانے کے لئے ہمیں کیا موقف اختیار کرنا چاہیے؟ اس پورے معاملے کی اہمیت اسی راز کو سمجھنے میں پوشیدہ ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہر صاحب ضمیر شخص کو چاہیے کہ ایسے لوگوں پر نہ صرف یہ کہ ناراض نہ ہو، بلکہ ان کے کاموں پر انہیں ملامت بھی نہ کرے۔

آج کے مبلغ اور مرشد حضرات کو چاہیے کہ مادی اور روحانی، دنیوی اور اخروی بربادی میں گھری ہوئی انسانیت کو اوپر ذکر کردہ زاویے سے دیکھے۔ تند مزاجی، مار پیٹ، سختی اور کرختگی مرشد کو زیب نہیں دیتی۔ جھوٹ اور سیاسی مفادات سے تو اسے کوسوں دور رہنا چاہیے۔ مرشد تو شفقت، محبت اور رحمت کا فدائی ہوتا ہے۔ ہدایت کے متلاشی کو ایسے ہی مرشد کی ضرورت ہے۔ اس بارے میں رسول اکرم ﷺ کی زندگی ہمارے لئے اسوہ حسنہ ہے۔

آپ ﷺ کی حیات طیبہ کو دیکھئے کہ لوگوں سے صرف ایک مرتبہ لا الہ الا اللہ کہلوانے کے لئے آپ ﷺ نے اپنے آپ کو کتنے خطرات میں ڈال دیا اور کتنی صعوبتیں برداشت کیں، حالانکہ جن لوگوں نے تیر برسا کر آپ ﷺ کو لہولہان کر دیا، آپ کا گلا گھونٹا، نماز کی حالت میں آپ ﷺ کے سر مبارک پر اوجھڑی ڈالی اور آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے آپ ﷺ صرف ان کی ہدایت

Marfat.com

کے خواہش مند اوران کے جنتی ہونے کے امیدوار تھے۔آپ ﷺ تو اپنے دشمنوں کی بھی خیرخواہی چاہتے تھے۔آپ ﷺ کا ان سے کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہ تھا۔طائف میں آپ ﷺ پر سنگ باری ہوئی، جس کی وجہ سے آپ ﷺ کا چہرہ اور قدم مبارک لہولہان ہو گئے اور آپ ﷺ کو ایک باغ میں پناہ لینی پڑی۔آپ ﷺ کے ساتھ حضرت زید رضی اللہ عنہ بھی تھے۔فرشتے نے آپ ﷺ کو پیش کش کی کہ اگر آپ ﷺ کہیں تو میں انہیں دو پہاڑوں کے درمیان پیس دوں؟ لیکن رؤوف ورحیم ذات نے ہاتھ بلند کر کے یہ دعا مانگی:

"أَرْجُو أَنْ يُخْرِجَ اللّٰهُ مِنْ أَصْلَابِهِمْ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهُ لَايُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا"

"مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسل میں ایسے لوگ پیدا کریں گے جو صرف اللہ کی عبادت کریں گے اوراس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔"(۱)

آپ ﷺ نے ان کا کسی بھی مصیبت میں گرفتار ہونا پسند نہیں کیا۔

بالکل اسی طرح میدانِ جنگ میں جب آپ ﷺ کے داندن مبارک شہید ہوئے، خود کا ایک حصہ آپ ﷺ کے چہرہ انور میں گھس گیا اور خون مبارک کے قطرے زمین پر گر پڑے تو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف یوں بلند کئے گویا آپ ﷺ قہر خداوندی کو نازل ہونے سے روک رہے ہوں اور یہ دعا فرمائی:

"اَللّٰهُمَّ غْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَايَعْلَمُوْنَ"

"اے اللہ میری قوم کو معاف فرما دیجئے کہ وہ جانتی نہیں۔"(۲)

اس طرح آپ ﷺ نے اس عذاب کو روک دیا جو بعض اوقات کافروں پر نازل ہو جاتا ہے۔اس دعا کے ایک ایک لفظ سے واضح طور پر رحمت اور شفقت پھوٹ رہی ہے۔

---

(۱) البخاري: بدأالخلق، ۷؛ مسلم: الجهاد، ۱۱۱؛ ابن كثير: البداية، ۳/۱۶۶-۱۶۸

(۲) البخاري: الأنبياء، ۵۴؛ مسلم: الجهاد، ۱۰۵؛ القاضي عياض: الشفاء، ۱/۱۰۵

Marfat.com

موضوع کی مناسبت سے میں ایک واقعہ یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں جسے میں پہلے بھی کئی مواقع پر بیان کر چکا ہوں:

ایک نوجوان نیا نیا مسلمان ہوا تھا۔ ایک مجلس میں جب اس نے نورانیت محسوس کی تو ایسی نورانی مجالس میں بار بار آنے لگا۔ انہی مجالس میں سے ایک مجلس میں جب میں نے مخالفین کی طرف سے پیش آنے والی نا قابل بیان زیادتیوں کا ذکر کیا تو ایک پر جوش نوجوان کھڑا ہو کر کہنے لگا: ''ایسے لوگوں کو ذبح کر دینا چاہیے۔'' جوں ہی اس نئے ہدایت یافتہ نوجوان نے یہ بات سنی تو اس کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس پر جوش نوجوان سے کہنے لگا: ''میرے دوست! یوں نہ کہو۔ اگر تم اس تجویز پر چند روز پہلے عمل کر چکے ہوتے تو میں تمہارے درمیان نہ ہوتا، بلکہ جہنم واصل ہو چکا ہوتا، حالانکہ اب میں تم میں سے ایک ہوں۔ مخالف جماعت کے لوگ بھی اس حسن معاشرت اور خوش معاملگی کے محتاج ہیں، جن کا میں نے مشاہدہ کیا ہے۔ ورنہ ہم صرف دوسروں کی آخرت ہی برباد کریں گے، جس کا ہمیں کوئی فائدہ ہے اور نہ ان کو۔''

مذکورہ بالا نوجوان کی جو بات میں نے اختصار کے ساتھ بیان کی ہے، یہ ان تمام نوجوانوں کے دل کی آواز ہے جو کفر والحاد کے عذاب میں گرفتار ہیں۔ میں بھی اس نوجوان کی طرح پوری قوت سے یہ بات کہتا ہوں کہ کفر میں مبتلا نوجوان تمہاری رحمت اور نرمی کے محتاج ہیں۔ طاقت اور زبردستی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، ہمیں جذبات کی بجائے عقل اور دلیل کی بنیاد پر فیصلے کرنے چاہئیں۔ ہمیں اپنے مخالفین کو دلائل کے ذریعے قائل کر کے دل اور روح کی دنیا سے آشنا کرنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرشد کو شدید ضرورت کے بغیر مخاطب کو الزامی جواب دینے سے گریز کرنا چاہیے۔

ایک پوری کی پوری نسل کو فنا کر دیا گیا اور مسجدوں کے راستوں پر شہوت اور خواہشات کی رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں۔ مادی خواہشات کی تکمیل کو نئی نسل کا مقصدِ حیات بنا دیا گیا اور انہیں دین، ایمان اور قرآن کی تعلیم سے بالکل بے بہرہ کر دیا گیا۔ اب یہ نسل ایک بحران میں مبتلا ہے، جو ایک بالکل متوقع اور فطری نتیجہ ہے۔ اس بدنصیب نسل اور بے حیا نوجوان کو ملامت اور غصے کا نشانہ نہیں بنانا چاہیے۔ لعنت کے اصل حق دار تو وہ لوگ ہیں، جنہوں نے نوجوان نسل کو اس دلدل

Marfat.com

میں دھکیلا ہے۔ اگر کوئی قصور ہے تو انہی لوگوں کا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ نوجوان نسل گناہوں سے پاک ہے، لیکن میرے نزدیک انہیں براہ راست ان کے گناہوں پر ملامت کرنا بے جاسختی اور کرختگی ہے، جس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے اس نسل کو اس دلدل سے نکالا جائے۔ یہی ہمارا مقصدِ حیات ہے۔

۲- ایثار و قربانی

اپنی اہمیت کے پیش نظر یہ موضوع اس بات کا بجا طور پر مستحق ہے کہ اس کے بارے میں ایک مستقل فصل قائم کر کے باریک بینی سے اس کا تجزیہ کیا جائے۔ ذیل میں میں غور و فکر کے لئے اس موضوع کے بعض نکات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں:

قربانی بھی مبلغ کا ایک اہم ترین وصف ہے۔ جو لوگ قربانی و ایثار کا حوصلہ نہیں رکھتے وہ کبھی بھی مبلغین نہیں کہلا سکتے۔ جو شخص قربانی کا جذبہ نہ رکھنے کی وجہ سے دعوت کے میدان میں ناکام ہو جائے، اس کی ناکامی پر کوئی تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جو لوگ جان و مال، اولاد، منصب اور شہرت (جن کے حصول کو دوسرے لوگ مقصد حیات سمجھتے ہیں) کی قربانی دینے کے لئے تیار رہتے ہیں، ان کی دعوت کے ثمرات یقیناً ظاہر ہوتے ہیں۔

جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں دعوت کا آغاز کیا تو آپ ﷺ نے قربانی و ایثار کی حقیقت کو نہ صرف خود سمجھا اور اپنایا بلکہ اپنے مددگار رشتہ داروں کو بھی سمجھایا۔ مثلاً سرور کائنات ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اس مقدس دعوت کی خاطر اپنی ساری دولت لٹا دی۔ آپ رضی اللہ عنہا نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا، بلکہ مشرکینِ مکہ کو دعوتِ اسلام دینے کے لئے جتنے بھی پروگرام ہوتے ان کے تمام اخراجات وہ خود اٹھاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مکے کی یہ امیر ترین خاتون فوت ہوئیں تو ان کی ملکیت میں کفن خریدنے کے لئے بھی رقم نہ تھی۔

خدا کے دین کے ہر داعی کو اپنے مادی وسائل سے بڑھ کر قربانی دینی پڑتی ہے، نیز حتی الامکان اپنے دین، فکر، آزادی اور انسانی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے بعض اوقات

Marfat.com

اسے اس معاشرے کو بھی چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑتی ہے، جس میں وہ پروان چڑھا ہوتا ہے۔ یہ قربانی کا ایک اور پہلو ہے، چنانچہ حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم سب نے ہجرت کی، نیز مکہ کے ہر مسلمان مرد و عورت، مالدار و فقیر اور پیر و جوان نے ہجرت کی۔ انہوں نے مکہ کے ظالموں اور جابروں کی وجہ سے اپنے آبائی وطن اور مال و دولت کو چھوڑا اور دورانِ سفر استعمال کے لئے برائے نام توشے کے سوا کوئی چیز ساتھ نہ لی۔ جب مہاجرین اپنی دعوت کی خاطر یہ تمام قربانیاں پیش کر چکے تو مدینہ منورہ کے انصار نے ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور انہیں اپنے گلے سے لگایا۔ یہ ایک دوسری نوعیت کی قربانی تھی، جس میں انہوں نے خود ضرورت مند ہونے کے باوجود مہاجرین کو اپنے اوپر ترجیح دی۔[1] آج کے مبلغ اور مرشد حضرات کو بھی قربانی کے اس تصور کی یاد تازہ کرنا ہوگی، جو بھی صحابہ کرام کے دور میں موجود تھی۔ ورنہ جیسا کہ مقدمے میں ہم نے لکھا ہے، توفیق خداوندی ان کے شامل حال نہ ہوگی۔

۳۔ دعا و مناجات

دعا بھی مبلغ کا لازمی وصف ہے۔ اس کی اہمیت دیگر اوصاف سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ مبلغ سامعین کے دلوں پر اپنی گفتگو کی تاثیر کو خدا کا احسان سمجھتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا مالک ہے۔ بندوں کے دل اس کے دست قدرت میں ہیں، جنہیں وہ جس طرح چاہتا ہے چلاتا ہے۔

ارشادِ خداوندی ﴿قُلْ مَا يَعْبَأُ بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا﴾ [الفرقان: ۷۷] ''کہہ دو اگر تم خدا کو نہیں پکارتے تو میرا پروردگار بھی تمہاری کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ تم نے تکذیب کی ہے سو اس کی سزا (تمہارے لئے) لازم ہوگی۔'' ہمیشہ مبلغ کے پیش نظر رہتا ہے، جو ایک حساس قطب نما کی طرح اسے خدا کے حضور دعا، گڑگڑاہٹ اور انابت کی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے۔

---

(۱) دیکھئے: البخاری: مناقب الانصار، ۳، البیوع، ۱؛ الکاندھلوی: حیاۃ الصحابۃ، ۱/۳۸۱

Marfat.com

بہت سے ایسے لوگ جن پر سحر انگیز گفتگو کا اثر نہیں ہوا، محض دعا اور آہ وزاری سے انہیں ہدایت مل گئی، نیز دعا جس طرح مومن کا ہتھیار ہے، اسی طرح مبلغ کے لئے انتہائی اہم حصار بھی ہے۔ مبلغ گفتگو کرنے سے پہلے اللہ تعالی کے حضور دعا مانگتا ہے لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ مبلغ عقلی استدلال اور اسلوب کو چھوڑ دے، بلکہ اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ مبلغ عقل منطقی طرز استدلال اور دعامیں سے ہر ایک کے موقع ومحل کو خوب جانتا ہے۔ ذیل میں ہم کچھ مثالیں ذکر کرتے ہیں جن سے ظاہر ہوگا کہ دعا کس قدر مؤثر ہوتی ہے:

رسول اکرم ﷺ نے لوگوں کی ہدایت کے لئے ہر طریقہ آزمایا۔ آپ ﷺ ہمیشہ دعا میں مشغول رہتے۔ آپ ﷺ نے کبھی بھی دعا ترک نہیں فرمائی۔ آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ بن خطاب کی ہدایت کے لئے دعا کی۔ دعا قبول ہوئی اور حضرت عمرؓ ایسے دن اسلام لے آئے، جس دن ان کے قبول اسلام کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ یہ سب حضور اکرم ﷺ کی دعا کی برکت تھی۔(۱)

ایک دن ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی ماں کی ہدایت کے لئے دعا کی درخواست کی۔ باقی تفصیل خود ان کی اپنی زبانی سنیے: ''میری ماں مشرکہ تھیں۔ میں انہیں اسلام کی دعوت دیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں ایسے نازیبا کلمات کہے جو مجھ پر گراں گزرے۔ میں روتا ہوا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنی والدہ کو اسلام کی دعوت دیا کرتا ہوں، لیکن وہ انکار کردیتی ہیں۔ آج میں نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے آپ ﷺ کی شان میں نازیبا کلمات کہے جو مجھ پر بہت ناگوار گزرے۔ آپ ﷺ اللہ سبحانہ وتعالی سے میری والدہ کی ہدایت کے لئے دعا فرمائیے۔'' چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے دعا کی: ''اے اللہ ابو ہریرہؓ کی والدہ کو ہدایت نصیب فرما۔'' میں رسول اللہ ﷺ کی دعا سن کر خوشی خوشی وہاں سے نکلا۔ جب میں گھر پہنچا تو گھر کا دروازہ

(۱) دیکھئے: ابن کثیر: البداية، ۳/۳۱؛ ابن الاثير: الأسد الغابة، ۴/۱۴۸؛ ابن سعد: الطبقات، ۳/۲۸۶

Marfat.com

بند پایا۔ میری والدہ نے میرے قدموں کی چاپ سن کر کہا: ''ابو ہریرہؓ! ذرا باہر ہی ٹھہرنا۔'' اس دوران میں نے پانی کے گرنے کی آواز سنی۔ میری والدہ غسل کر رہی تھیں۔ انہوں نے چادر اپنے بدن پر لپیٹی۔ جلدی میں دوپٹا لینا بھی بھول گئیں اور دروازہ کھول کر مجھ سے کہا: ''ابو ہریرہ! میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ﷺ ہیں۔'' یہ سن کر میں فوراً لوٹ کر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت میری حالت یہ تھی کہ خوشی سے میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ (۱)

۴۔ منطقی طرزِ استدلال اور واقعیت پسندی

اس کے ساتھ ساتھ مبلغ واقعات کو پرکھنے اور سامعین کو اپنی بات سمجھانے کے لئے بڑے منطقی طرز استدلال کا حامل ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے مخاطبین کے مرتبے اور ذہنی سطح کا لحاظ رکھتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ مخاطبین کو اپنی بات پر قائل کر لیتا ہے۔ اس کی بات کو سب پسند کرتے ہیں۔ اس کے قول و فعل کے نامعقول یا زمینی حقائق کے خلاف ہونے کا کوئی الزام نہیں دیتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مبلغ مناطقہ جیسا خشک اسلوب اختیار کر لے، بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کی تمام باتوں کے درمیان منطقی ربط پایا جائے، نیز وہ خارجی حقائق کے مطابق اور معقول ہوں۔ اس موقع پر حضور ﷺ کی سیرت طیبہ سے ایک مثال پیش کرنا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو:

عورت حضرت جلیبیب رضی اللہ عنہ کی کمزوری تھی۔ صحابہ کرام ان کے اس قسم کے کردار سے نالاں تھے، لیکن اصلاح کی کوئی صورت بھی نظر نہ آتی تھی۔ آخر انہوں نے اس بات کا حضور ﷺ سے ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے انہیں بلوا بھیجا۔ جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو حضور ﷺ اور ان کے درمیان درج ذیل مکالمہ ہوا:

حضور ﷺ: کیا تم یہ بات اپنی والدہ کے لئے پسند کرتے ہو؟

---

(۱) دیکھئے: ابن سعد: الطبقات، ۴/۳۲۸؛ ابن حجر: الاصابة ۴/۲۴۱

Marfat.com

جلبیب: میری جان آپ ﷺ پر قربان! خدا کی قسم، ہرگز نہیں۔

حضور ﷺ: دوسرے لوگ بھی اپنی ماؤں کے لئے یہ بات پسند نہیں کرتے۔
کیا تم یہ بات اپنی بیٹی کے لئے پسند کرتے ہو؟

جلبیب: یارسول اللہ! میری جان آپ ﷺ پر قربان ہو۔ ہرگز نہیں۔

حضور ﷺ: دوسرے لوگ بھی اپنی بیٹیوں کے لئے یہ بات پسند نہیں کرتے۔
کیا تمہیں یہ بات اپنی بہن کے لئے پسند ہے؟

جلبیب: میری جان آپ ﷺ پر فدا ہو، خدا کی قسم! ہرگز نہیں۔

حضور ﷺ: دوسرے لوگ بھی اپنی بہنوں کے لئے یہ بات پسند نہیں کرتے۔
کیا تم یہ بات اپنی پھوپھی کے لئے پسند کرتے ہو؟

جلبیب: میری جان آپ ﷺ پر قربان! خدا کی قسم، ہرگز نہیں۔

حضور ﷺ: دوسرے لوگ بھی اپنی پھوپھیوں کے لئے یہ بات پسند نہیں کرتے۔
کیا تم اپنی خالہ کے لئے یہ بات پسند کرتے ہو؟

جلبیب: میری جان آپ ﷺ پر فدا! خدا کی قسم ہرگز نہیں۔

حضور ﷺ: دوسرے لوگ بھی اپنی خالاؤں کے لئے یہ بات پسند نہیں کرتے۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے ان کے سینے پر اپنا دست مبارک رکھا اور دعا فرمائی: ''اے اللہ اس کے گناہ معاف فرما دیجیے۔ اس کے دل کو پاک کر دیجیے اور اس کی شرمگاہ کی حفاظت فرمایئے۔''[1] یہ دعا فرمائی تھی کہ حضرت جلبیب رضی اللہ عنہ مدینہ کے سب سے زیادہ پاکباز نوجوان بن گئے۔

کچھ عرصے کے بعد رسول اللہ ﷺ ایک غزوہ کے لئے نکلے۔ جنگ کے بعد آپ ﷺ نے صحابہ سے پوچھا: ''کون کون موجود نہیں؟'' صحابہ نے عرض کیا۔ فلاں فلاں شخص موجود نہیں۔

---

(۱) الامام أحمد: المسند، ۲۵۶/۵-۲۵۷

Marfat.com

آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا ان کے علاوہ بھی کوئی غائب ہے؟'' صحابہ نے عرض کیا: ''نہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''لیکن مجھے جلیبیبؓ نظر نہیں آرہا۔ اسے مقتولین میں تلاش کرو۔'' چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کی تلاش میں نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ کفار کی سات لاشوں کے درمیان شہید ہوئے پڑے ہیں، جنہیں قتل کرنے کے بعد خود بھی شہید ہو گئے۔ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ وہ سات کافروں کو قتل کرنے کے بعد خود بھی ان کے ہاتھوں شہید ہوئے پڑے ہیں۔ حضور ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''اس نے سات کافروں کو قتل کیا اور پھر خود بھی ان کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔ یہ میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔ یہ میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔'' آپ ﷺ نے یہ بات دو یا تین مرتبہ ارشاد فرمائی۔ اس کے بعد ان کے لئے قبر کھودی گئی۔ آپ ﷺ نے انہیں اپنے بازو پر اٹھایا۔ حضور ﷺ کے بازو ہی اُن کی چارپائی تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں خود اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا۔(1) دیکھئے! حضرت جلیبیب رضی اللہ عنہ حکیمانہ اسلوب اور دعا کی برکت سے جنتی بن گئے۔

۵- عفو و درگزر

مبلغ کا مزاج عفو و درگزر کا ہوتا ہے۔ درحقیقت عفو و درگزر کشادہ دلی اور وسعت نظری کی دلیل ہے۔ مداہنت یا دعوت سے دستبرداری سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے:

کفارِ مکہ نے حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے پیروکاروں کو مکہ سے نکالا اور انہیں ہر طرح کی تکلیفیں پہنچائیں، لیکن اس کے باوجود فتحِ مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے جو بات ان سے کہی تھی، وہ عفو و درگزر کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: ''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تم سے کیسا برتاؤ کرنے والا ہوں''؟

(1) مسلم، فضائل الصحابة ۱۳۱؛ الامام أحمد: المسند، ۴/ ۴۲۰-۴۲۱؛ الهيثمي: مجمع الزوائد، ۹/ ۳۶۸

Marfat.com

انہوں نے جواب دیا: ''ہمیں آپ ﷺ سے اچھے برتاؤ کی امید ہے، کیونکہ آپ کریم النفس بھائی ہیں اور کریم النفس باپ کے بیٹے ہیں۔'' آپ ﷺ نے ان سے وہی بات کہی جو سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: ﴿لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾ [سورۃ یوسف:۹۲] ''آج کے دن (سے) تم پر کچھ عتاب (وملامت) نہیں ہے۔ خدا تم کو معاف کرے اور وہ بہت رحم کرنے والا ہے۔'' حضرت یوسف علیہ السلام نے تو اپنے بھائیوں سے درگزر کیا تھا، جبکہ آپ ﷺ نے اپنے دشمنوں سے درگزر فرمایا۔ اس اعتبار سے آپ ﷺ سیدنا یوسف علیہ السلام سے بڑھ کر کریم النفس ثابت ہوئے۔

۶- حساس مزاجی

مبلغ، لوگوں کی راہِ حق سے گمراہی کے بارے میں بہت حساس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی نافرمانی اور حق سبحانہ وتعالیٰ پر اعتراضات دیکھ کر اسے دلی صدمہ پہنچتا ہے۔ جب وہ لوگوں کی دینی بے راہ روی کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے تو اس کے غم والم اور بے قراری واضطراب میں اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔ دعوت وتبلیغ کی خاطر شدتِ احساس اور اضطراب کی وجہ سے رسولِ اکرم ﷺ کی طبیعت میں پیدا ہونے والی نفسیاتی کیفیت کو قرآن کریم درج ذیل آیاتِ مبارکہ میں بیان کرتا ہے: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ [الشعراء:۳] ''اے پیغمبر! شاید تم اس (رنج) سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنے تئیں ہلاک کردو گے۔'' ہر مبلغ کی یہی نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے اور ہونی چاہیے۔

ردت سے مراد دین حق سے پھر جانا ہے۔ مرتد اس شخص کو کہتے ہیں جو ان تمام مقدسات کا انکار کردے، جن پر وہ پہلے ایمان رکھتا تھا، اس طرح وہ مسلمانوں اوران کے عقیدے کی توہین اور تحقیر کرتا ہے، چونکہ جو شخص مسلمانوں کی ایک بار تحقیر کرے اس سے مسلمانوں کی بار بار توہین بعید نہیں، اس لئے بعض علماء کی رائے میں ایسے شخص کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ تاہم فقہائے کرام نے ہر حکم کے لئے اصول وضع کئے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ وہ جس بات کی وجہ سے مرتد ہوا ہے پہلے

Marfat.com

اسے وہ بات سمجھائی جائے اور ہر پہلو سے اسے قائل کرنے کی کوشش کی جائے، لیکن اگر تمام ترکوششوں کے باوجود وہ حق بات کا قائل نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کے لئے خطرناک مرض کی صورت اختیار کر گیا ہے، لہٰذا اب اس کے ساتھ اسی کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔(۱) اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی مومن کسی شخص کے ارتداد پر خاموش تماشائی نہیں بن سکتا۔ ارتداد کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس قسم کا واقعہ سن کر ہر مومن کو اس کے جذبات اور احساسات کے مطابق تکلیف ہوتی ہے، لیکن مبلغ کو سب سے زیادہ حزن والم ہوتا ہے، کیونکہ وہ بخوبی جانتا ہے کہ لوگوں کو سیدھی راہ دکھانا ہی اس کا مقصد حیات ہے۔ ایک مرتبہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے ارتداد کے ایک واقعے میں اسلامی اصولوں کی رعایت کرنے میں کچھ کوتاہی ہوگئی۔ رسول اللہ ﷺ کو جب اس واقعے کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ کو بہت رنج ہوا اور آپ ﷺ نے خدا کے حضور التجاء کی:

"اَللّٰھُمَّ اِنِّي اَبْرَأُ اِلَیْکَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ"

"اے اللہ! میں آپ کے سامنے خالد کے اس اقدام سے براءت کا اظہار کرتا ہوں۔"(۲)

رسول اکرم ﷺ کی اس حساس مزاجی کا عکس صحابہ کرام کے دلوں پر بھی نظر آتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس یمامہ سے ایک شخص آیا۔ آپؓ نے اس سے پوچھا: "وہاں کوئی خاص بات پیش آئی ہو تو بتاؤ۔" اس نے کہا: "اور تو کوئی خاص بات نہیں، البتہ ایک شخص اسلام لانے کے بعد دوبارہ مرتد ہو گیا تھا۔" آپؓ نے پوچھا: "پھر تم نے اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟" اس نے کہا: "ہم نے اس کی گردن اڑا دی۔" حضور ﷺ کی طرح حضرت عمرؓ کو بھی اس پر بہت افسوس ہوا اور آپؓ نے کہا: "تم نے اسے تین دن تک مہلت دے کر اچھے اچھے کھانے کیوں نہ کھلائے اور توبہ کرنے کے لئے کیوں نہ کہا؟ شاید وہ توبہ کر کے خدا کے دین کو پھر سے قبول

(۱) دیکھئے: البخاری: الدیات، ٦؛ مسلم: القسامة، ٢٥؛ السرخسی: المبسوط، ١٠/٩٨؛ الکسانی: بدائع الصنائع، ٧/١٣٤

(۲) البخاری: المغازی، ٥٨؛ ابن هشام: السیرة، ٤/٧٢

Marfat.com

کر لیتا۔‘‘ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا: ’’اے اللہ! نہ میں اس موقع پر موجود تھا، نہ میں نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا اور نہ ہی اس واقعے کی اطلاع ملنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا ہے۔‘‘(۱)

۷۔ روحانی گہرائی

مبلغ روحانی اعتبار سے بہت گہری شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ دوسروں پر اس کی گفتگو کا اسی قدر اثر ہوتا ہے، جس قدر اس کی روحانیت میں گہرائی پائی جاتی ہے۔ وہ جس قدر اللہ رب العزت کے قریب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اسی قدر اسے اپنے قریب کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ اس کا دیکھنا سننا اور پکڑنا اللہ کی مرضی کے تابع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی ہر حرکت و سکون کا محرک بن جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کے تمام کام تائید خداوندی سے ہوتے ہیں۔ جس قدر وہ اپنے علم پر عمل کرتا ہے، اسی قدر اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسے مزید علم عطا فرماتے اور اس کی غلطیوں کی اصلاح کرتے ہیں، نتیجتاً وہ انتہائی مشکل اور الجھے ہوئے معاملات کو بڑی آسانی سے سلجھا لیتا ہے۔ مستقل مزاجی کی وجہ سے وہ معاشرے میں دوسروں سے ممتاز نظر آتا اور راہِ راست کا علم بردار کہلاتا ہے۔ جب کسی شخص پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے تو باری تعالیٰ کے مقدس فیوض کا اس پر نزول ہونے لگتا ہے۔ ان فیوض و برکات کی مقناطیسی جاذبیت کے ذریعے اس کی دعوت وارشاد کا سلسلہ چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کا حلقہ اثر ایک ایسے ظلِ الٰہی کی مثل ہو جاتا ہے، جس کے نیچے لاکھوں انسان پناہ لیتے ہیں۔ بڑے بڑے صوفیاء اور مشائخ میں پائی جانے والی شدید جاذبیت اسی باطنی گہرائی کا نتیجہ تھی، کیونکہ اس پر تک پہنچ کر مرشد کو یقین کامل کی دولت میسر آ جاتی ہے اور وہ یقین کی سحر انگیز قوت کا مالک بن جاتا ہے۔ یقین کا حصول کمالِ ایمان کے مترادف ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

’’یقین پورے کا پورا ایمان ہے۔‘‘(۲)

یقین سے مراد مومن کی عقل کو دلائل سے مسلح کرنا، اس کے ذہن کو فکر عطا کرنا، اس کے

(۱) الموطأ: الأقضية، ۵۸

(۱) البخاری: الایمان، ۱

Marfat.com

افکار کو الہام سے منور کرنا، اس کے نفس کے لوبان کو عبادت واطاعت سے روشن کرنا اور اس کے دل کو ایسا صاف آئینہ بنا دینا ہے، جو ہمیشہ مراقبہ ومشاہدہ کے ذریعے دیدارِ حق میں مشغول رہے۔

یقین توحید سے وصل کے مترادف ہے۔ جو شخص یقین کے مقام تک پہنچ جائے اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف رہتا ہے اور نہ کسی سے امید، چونکہ اسے اس بات پر یقین ہوتا ہے کہ ہر اچھی اور بری چیز کے خالق اللہ تعالیٰ ہیں، اس لئے وہ ہر چیز کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے سمجھتا ہے۔

جسے یقین کا یہ مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے، وہ سستی یا خوف کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ موت کو ہنسی خوشی قبول کر لیتا ہے۔ وہ دنیا ہی میں آخرت کی زندگی گزارنے لگتا ہے، کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ موت کے ذریعے اس ذات تک رسائی حاصل ہو جائے گی، جس کے دیدار کے لئے وہ بے تاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ خوش وخرم رہتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے: ''مجھے ملأ اعلیٰ نے بتایا ہے کہ میری امت کے بہترین لوگ وہ ہیں، جو اپنے پروردگار کی وسعتِ رحمت کی وجہ سے جلوت میں ہنستے رہتے ہیں، لیکن رات کو خلوت میں اپنے رب کے عذاب کے خوف سے اُن کے آنسو بہتے ہیں۔ ان کے دل تو دنیا میں ہوتے ہیں، لیکن ان کی روحیں آخرت میں ہوتی ہیں۔ (۱)

ہر مرشد کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کا شمار ان اہل یقین میں ہو جائے جو دنیا و آخرت کا بیک وقت مشاہدہ اور ان دونوں میں وحدت محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں ایسے مشائخ کی تلاش ہے، جن کے دلوں میں دنیا کی طرف ذرا بھی میلان نہ ہو۔ اگر دعوت وتبلیغ کی ذمہ داری نہ ہوتی تو وہ اس میں رہنے کا سوچتے بھی نہیں، ایسے مشائخ 'اخلاقِ محمدیہ' سے مزین ہوتے ہیں، ہر مرشد کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔

مثنوی رومی کے شارح سید مولوی طاہر لکھتے ہیں: ''شیخ عاطف بہت اچھے لکھاری اور تعلیم یافتہ شخص تھے۔ میں ان کے ہمراہ جیل میں تھا۔ ایک رات انہوں نے اگلی صبح اپنے مقدمے کی آخری پیشی میں اپنی صفائی میں پیش کرنے کے لئے بڑی مضبوط رپورٹ تیار کی مگر نمازِ فجر کے بعد وہ رپورٹ

---

(۱) المستدرك: ۳/ ۱۷؛ البیہقی: شعب الایمان، ۱/ ۴۷۸

Marfat.com

پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دی۔ میں نے ان سے پوچھا: ''ماجرا کیا ہے؟ آپ نے اپنی صفائی میں لکھی ہوئی رپورٹ کیوں پھاڑ دی؟'' توانہوں نے جواب میں کہا: ''آج رات مجھے سرورِ کونین حضرت محمد ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ میں بیٹھا اپنی صفائی کی رپورٹ لکھ رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''عاطف! تم کن کاموں میں پڑ گئے ہو؟ کیا تم ہمارے پاس آنا پسند نہیں کرتے؟ ''میں نے کہا: ''کیوں نہیں؟ یارسول اللہ!'' اس کا مطلب ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ ملاقات کا وقت قریب آ گیا ہے اس لئے اب صفائی کی رپورٹ کی کیا ضرورت؟''

چنانچہ دوسرے دن عدالت نے انہیں پھانسی کا حکم سنا دیا، چونکہ اس فیصلے کے نتیجے میں ان کی حضور ﷺ سے ملاقات ہونے والی تھی، اس لئے انہوں نے مسکراتے ہوئے بڑے اطمینان کے ساتھ اس فیصلے کا سامنا کیا۔ ایسا عمدہ موقع پانے والا شخص خوش کیوں نہ ہو؟ اس راستے پر استقامت کے ساتھ چلنے والے، ہر وقت رضائے خداوندی کا خیال رکھنے والے اور ہر قدم پر اللہ اور اس کے رسول کی توفیق پر یقین رکھنے والے شخص پر اطمینان اور سکینہ کیوں نہ نازل ہو؟ ایسے شخص کو تختہ دار پر چڑھا کر قتل تو کیا جا سکتا ہے لیکن مغلوب نہیں۔

مبلغ ہمیشہ روح کی پاکیزگی اور لطافت کا اہتمام کرتا ہے۔ اسی کے نتیجے میں اسے توفیق خداوندی حاصل ہوتی ہے، کیونکہ جو شخص اپنے آپ کو خدا کے لئے وقف کر کے اس کی خوشنودی کے حصول میں لگ جاتا ہے وہ آج نہیں تو کل قیامت کے دن ضرور اپنے مقصد کو پا لیتا ہے۔ جس نے خدا کو پا لیا اس نے سب کچھ پا لیا اور جسے خدا نہیں ملا اس نے سب کچھ کھو دیا خواہ پوری دنیا اس کی ملکیت میں کیوں نہ آ جائے۔ کیا سلیم الطبع اور پاکیزہ دل کے ساتھ خدا کا وصال ہی سب کچھ نہیں؟ پھر ہم ایسے فضول بکھیڑوں میں کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اپنے ساتھ ملاقات کے دن تک ہمارے دلوں کی لطافت اور پاکیزگی کی حفاظت فرمائے، بے شک وہ ہمارا پروردگار ہے، ہمارا ایمان ہے کہ اس کی رحمت ہر چیز کو شامل اور اس کے غصے پر حاوی ہے، ہم اس کی خوشنودی اور رحمت کے سوا کسی چیز کے طلب گار نہیں۔

Marfat.com

۸- شوق واشتیاق

مبلغ شوق وعشق کی فضا میں فریضہ تبلیغ ادا کرتا ہے۔اس کی تبلیغ اس کا شوق اور عشق ہوتا ہے۔وہ کسی معاوضے کا طلب گار نہیں ہوتا۔اس احساس کا مبلغ میں پیدا ہونا ضروری ہے،لیکن اس احساس کو پیدا کرنا آسان نہیں بلکہ بہت مشکل کام ہے۔اس کے لئے بہت عرصے تک محنت کرنی پڑتی ہے۔اگر رسول اکرم ﷺ نے شروع سے ہی صحابہ کرام کے دلوں میں یہ احساس پیدا نہ کیا ہوتا اور انہیں حق کا شیدائی نہ بنایا ہوتا تو اسباب کے دائرے میں آپ ﷺ کی دعوت کا اس قدر پھیلنا ممکن نہ تھا۔

دیکھئے حضرت خالدؓ بن ولید رومیوں کے سردار سے ملتے تھے تو پہلے اسے اسلام کی دعوت دیتے تھے۔[1] صحابہ کرام تلوار کی زبان میں بات کرنے سے پہلے اسلام کی دعوت دیتے تھے۔یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب تبلیغ کا شوق ہر چیز پر غالب ہو۔

تبلیغ کے اسی سوزِ عشق کا اثر تھا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین دعوت وتبلیغ کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑ کر اطراف عالم میں پھیل گئے۔صحابہ کرامؓ کی ایک مثال آپ کے پیش خدمت ہے:

حضرت خُبیب رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر کے مکہ لے جایا گیا۔کچھ عرصہ قید میں رکھنے کے بعد انہیں سرعام پھانسی دینے کے لئے باہر لایا گیا۔آپؓ اس وجہ سے پریشان اور غمزدہ تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے سونپی گئی تبلیغ کی ذمہ داری کو ادا کرنے کا انہیں موقع نہیں مل رہا۔ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا کر اور منہ پر پٹی باندھ کر انہیں مقتل کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ان کی نگاہیں مسلسل اردگرد کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھیں، جسے وہ دین کی دعوت دے سکیں،لیکن آپؓ کو کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔باوجود اس کے کہ ان میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جو بعد میں صحابی بن گئے،لیکن اس وقت تک ان کی بصیرت کی آنکھیں ابھی نہیں کھلی تھیں۔حضرت خُبیب رضی اللہ عنہ نے ان سے

---

(۱) دیکھئے:ابن کثیر:البدایۃ،۱۳/۷

Marfat.com

کہا: ”اگر تم لوگ مجھے اجازت دو تو میں دو رکعت نماز پڑھ لوں؟“ انہوں نے کہا: ”ٹھیک ہے۔ پڑھ لو۔“ چنانچہ آپؓ نے بڑے سکون اور اطمینان سے دو رکعت نماز ادا کی اور پھر ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر گویا ہوئے: ”خدا کی قسم! اگر تم یہ نہ سمجھتے کہ میں موت کے خوف سے نماز کو لمبا کر رہا ہوں تو میں مزید اطمینان سے نماز ادا کرتا۔“(۱) اس کے بعد انہوں نے حضرت خُبیبؓ کو پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا۔ اب آخری وقت آ پہنچا تھا۔ ان کی طرف نیزہ سیدھا کر دیا گیا تھا، لیکن حضرت خُبیبؓ کی نگاہیں ابھی بھی کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھیں، جسے وہ اسلام کی دعوت دے سکیں۔ وہ کسی ایسے شخص کو نہیں تلاش کر رہے تھے، جو انہیں موت کے منہ سے بچا لے، بلکہ انہیں ایسے شخص کی تلاش تھی، جس کی ابدی زندگی کو وہ اپنے آخری لمحات میں بچا سکیں۔ خدا کی شان! دعوت الی اللہ کے عشاق کے سامنے اُن کے مغلوب ہونے کی حالت میں بھی موت کس قدر ناکام و نامراد ہوتی ہے، آخری لمحات میں بھی انہیں ایک غیر متوقع موقع مل گیا۔ ہوا یوں کہ مشرکینِ قریش کے ایک سردار نے ان سے سوال کیا، جبکہ سوال اتنا اہم نہیں تھا جتنا کہ حکمت سے بھرپور جواب۔ یہ دعوت کی ذمہ داری ادا کرنے کا ایک بہترین موقع تھا۔ بعض اوقات فکر کی ایک چنگاری مستقبل میں بہت سے دلوں میں ایمان کی آگ لگانے کا سبب بن جاتی ہے۔ سوال یہ تھا: ”کیا تمہیں پسند ہے کہ آج تمہاری جگہ یہاں محمد ﷺ ہوتے اور ہم ان کی گردن اڑا دیتے اور تم خیریت کے ساتھ اپنے گھر میں ہوتے؟“ یقیناً یہ سوال کسی عام مسلمان سے بھی نہیں پوچھا جانا چاہیے تھا، چہ جائیکہ حضرت خُبیبؓ جیسے جلیل القدر صحابی سے پوچھا جاتا، لیکن حضرت خُبیبؓ کو اس سوال کی وجہ سے ان تک اسلام کی دعوت پہنچانے کا موقع مل گیا۔ خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات کی وجہ سے وہ زیادہ دیر گفتگو نہ کر سکتے تھے، اس لئے انہوں نے چاہا کہ اپنی نماز کی طرح کوئی مختصر سی بات کہیں، بلکہ ایک ہی جملے میں اپنی پوری زندگی کا حاصل بیان کر دیں، جو ہمیشہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ اور کانوں میں گونجتا رہے۔ انہوں نے واقعی یہ کارنامہ کر دکھایا۔ انہوں نے

(۱) دیکھئے: ابن کثیر: البدایة، ٤/٦٥

Marfat.com

جواب میں کہا: ''خدا کی قسم! مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ محمد ﷺ اب جس جگہ تشریف فرما ہیں، وہاں انہیں ایک کانٹا چبھنے کی بھی تکلیف ہو اور میں اپنے گھر والوں میں آرام سے بیٹھا ہوں۔''(۱) سبحان اللہ کیا وفاداری ہے! ایسی پاکیزہ روح کی رفعتوں کے کیا کہنے!

یہ بات کہنے کے بعد تبلیغ کے فریضے کی عدم ادائیگی کی وجہ سے حضرت خُبیبؓ کو جو بے چینی محسوس ہو رہی تھی ختم ہوگئی اور ان کی طبیعت ہلکی ہوگئی۔ اب انہیں صرف رسول ﷺ کو الوداعی سلام کہہ کر جنت کی طرف جانا تھا۔ انہیں اس بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں تھی کہ مکہ سے ان کا سلام مدینے پہنچے گا بھی یا نہیں؟ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ کس شخصیت کو سلام بھیج رہے ہیں۔

سولی پر چڑھتے ہوئے جو آخری بات حضرت خُبیبؓ نے کہی تھی وہ ''السلام علیک یا رسول اللہ'' تھی۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ میں صحابہ کرام میں بیٹھے تھے کہ اچانک کھڑے ہوگئے اور فرمایا: ''وعليك السلام يا خبيب''(۲)

ہر صاحب دعوت کو تبلیغ کے شوق اور عشق کے اس مرتبے تک پہنچنا چاہیے، جس مرتبے تک حضرت خُبیب پہنچے تھے۔ اس کے بعد ہی وہ تاریخ کے مخالف بہاؤ کو کہہ سکے گا: ''ٹھہر جا۔'' اس کے بعد ہی وہ زمانے کے مخالفانہ رجحانات وافکار کو عبور کر کے زمانے کو صحیح رخ پر ڈال سکے گا۔ اس کے بعد ہی وہ زمین پر اللہ کے خلیفہ ہونے کی ذمہ داریوں کو کما حقہ ادا کرنے والا کہلا سکے گا۔

۹۔ دل کی پاکیزگی اور روحانی لطافت

داعی کو دعوت و تبلیغ کے دوران دل کی پاکیزگی اور روحانی لطافت کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔ اسے اپنے دل کو اپنی دعوت کی طرح پاکیزہ و تابناک بنانا چاہیے۔ ورنہ جس قدر اس کی روحانی دنیا میں گدلاہٹ پیدا ہوگی، اسی قدر اس کے اور حق سبحانہ وتعالیٰ کے تعلقات میں کدورت

---

(۱) ابن كثير: البداية، ٤/ ٥٦

(۲) ابن كثير: البداية، ٧/ ٦٦، ٦٩

Marfat.com

آئے گی، جس کے نتیجے میں اس کی گفتگو کی تاثیر جاتی رہے گی۔ اس کی کچھ وضاحت درج ذیل الفاظ سے کی جاسکتی ہے:

مبلغ، تبلیغ کے عوض خوشنودیٔ خداوندی کے سوا کسی چیز کا طلب گار نہیں ہوتا۔ جب تک اس کی یہ کیفیت رہتی ہے وہ خدا کو اپنے ساتھ پاتا اور رسول اللہ ﷺ کی روحانی برکات اور عظیم لوگوں کی دعاؤں کو اپنی پشت پناہ محسوس کرتا ہے۔ اس بات میں کسی کو تردد نہیں ہوسکتا، کیونکہ اگر زمین میں ڈالے گئے بیج سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ہزار دانوں میں تبدیل ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ کی طاقت وقدرت پر تو اور زیادہ بھروسہ ہونا چاہیے۔ اللہ کے علاوہ کسی اور سے امید باندھنا بڑے خسارے کا سودا ہے۔ درحقیقت یہ ہمارے عقیدہ توحید کا بھی تقاضا ہے، کیونکہ جس طرح اللہ کی ذات میں اس کا کوئی شریک نہیں، اسی طرح اس کے افعال میں بھی اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ ہدایت اور گمراہی بھی صرف اسی کے دست قدرت میں ہے۔ وہ مالک الملک ہے، جسے چاہتا ہے بادشاہت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے بادشاہت چھین لیتا ہے، جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔

یقیناً مجاہدہ نفس کے ذریعے دل کی پاکیزگی اور روحانی لطافت کے اس بلند ترین مقام پر پہنچنا بہت مشکل اور دشوار ہے، لیکن اتنے بلند ہدف تک رسائی یقیناً بہت خوش قسمتی اور سعادت کی بات ہے۔

ذرا امام ابوحنیفہ نعمان کی شخصیت کو دیکھیے۔ انہوں نے اپنے دل کی پاکیزگی اور روحانی لطافت کی حفاظت کی خاطر قضا کے عہدے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ سے انہیں کوڑوں کی سزائیں بھی جھیلنی پڑیں، لیکن جس چیز کو وہ اپنی روح کے لئے نقصان دہ سمجھتے تھے اسے ہرگز قبول نہ کیا۔[1] اسی طرح امام شافعی نے بھی اس قسم کے عہدے سے بچنے کے لئے پوری کوشش

(۱) دیکھیے: الذھبی: تذکرة الحفاظ، ۱/۱۶۸؛ ابن خلکان: وفیات الاعیان، ۵/۴۰۷؛ الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، ۱۳/۳۲۶، ۳۲۸

Marfat.com

کی(۱) بلکہ حکومت کی طرف سے عہدے اور منصب کو قبول کرنے کے لیے دباؤ کے باوجود عام لوگوں کی طرح بقدرِ ضرورت روزی پر قناعت کرنے اور روپوشی کو ترجیح دی، تاکہ جو آزمائش ابوحنیفہ کو پیش آئی وہ انہیں پیش نہ آئے۔

قرآن کریم کی خاطر امام احمد بن حنبل کی قربانیاں تاریخ کے صفحات سے نہ مٹی ہیں اور نہ کبھی مٹیں گی۔ انہوں نے ''قرآن مخلوق نہیں'' کی صدا بلند کی اور تمام عمر اس پر ڈٹے رہے۔(۲)

حالانکہ اشارہ و کنایہ کا سہارا لے کر ان کے لئے اس مشکل سے نکلنا بہت آسان تھا لیکن ان کی ایمانی غیرت نے اسے کبھی گوارہ نہیں کیا۔

ذیل کی روایت سے امام احمد بن حنبل کے جذبات کا پتہ چلتا ہے:

امام بیہقی نے حضرت ربیع سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے امام شافعی نے ایک خط دے کر امام احمد بن حنبل کے پاس بھیجا۔ جب میں ان کے پاس پہنچا تو وہ نماز فجر سے فارغ ہو چکے تھے۔ میں نے وہ خط ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ انہوں نے پوچھا: ''کیا تم نے اسے پڑھا ہے؟'' میں نے کہا: ''نہیں۔'' انہوں نے خط لے کر پڑھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔ میں نے پوچھا: ''ابوعبداللہ! اس میں کیا لکھا ہے؟'' انہوں نے جواب دیا: ''امام شافعی خط میں لکھتے ہیں کہ انہیں خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہوئی ہے۔ آپ ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا: ''اللہ کے بندے احمد بن حنبل کی طرف خط لکھو۔ اسے میری طرف سے سلام پہنچاؤ اور اسے بتادو کہ عنقریب تم پر ایک آزمائش آنے والی ہے۔ تمہیں قرآن کریم کو مخلوق کہنے کے لئے کہا جائے گا تم ان کی بات نہ ماننا۔ اللہ تعالیٰ تمہاری وجہ سے علم کو قیامت تک کے لئے سربلندی عطا فرمائیں گے۔'' ربیع کہتے ہیں کہ میں نے ان سے کہا: ''خوشخبری کی مٹھائی کھلایئے۔'' انہوں نے اپنے بدن پر موجود قمیص

---

(۱) دیکھئے: ابن حجر: طوالع التأسیس، ۷۷/۸٤؛ عبدالغنی الدقر: الامام الشافعی، ۳۸۰، ۳۸۱

(۲) دیکھئے: الذھبی: سیر اعلام النبلاء، ۲۳۹/۱۱، ۲٤۰؛ ابو نعیم: الحلیة، ۲۰٦/۹

Marfat.com

اتار کر مجھے عطا فرمائی۔ میں نے واپس لوٹ کر امام شافعی کو ساری بات بتائی تو انہوں نے فرمایا: ''میں اس قمیص کے بارے میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اسے بھگو کر اس کا پانی مجھے دے دو تاکہ میں بھی اس سے برکت حاصل کر سکوں۔[1]

(۱) ابن عساکر: تاریخ دمشق، ۲۵۰/۳؛ دیکھئے: ابن کثیر: البدایة، ۳۳۱/۱۰

Marfat.com

Marfat.com

حاصلِ کتاب

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے اختتام پر اسلام میں دعوت و تبلیغ کے اصول وضوابط کا خلاصہ نقاط کی صورت میں درج کر دیا جائے:

۱: دعوت وارشاد ہر مسلمان کی مقدس ترین ذمہ داری ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بہترین اور برگزیدہ بندوں یعنی انبیائے کرام کو یہ ذمہ داری سونپ کر دنیا میں بھیجا۔

۲: اگرچہ عام حالات میں تبلیغ فرض کفایہ ہوتی ہے، لیکن دورِ حاضر میں اسے نظر انداز کیا جانے کی وجہ سے اس کی اہمیت اہم ترین فرائض جیسی ہوگئی ہے، اس لئے اس سے کسی صورت میں غفلت برتنا درست نہیں۔

۳: اگر کسی شخص کی اس ذمہ داری کو نظر انداز کرتے ہوئے موت واقع ہو جاتی ہے تو چونکہ اس نے انفرادی فرائض سے زیادہ اہم اور زیادہ ثواب کی حامل ذمہ داری کو چھوڑ رکھا تھا، اس لئے اس کے بارے میں نفاق کا اندیشہ ہے۔

۴: جس معاشرے میں دعوت وتبلیغ کا فریضہ سرانجام دیا جاتا ہے (خواہ اس مقدس فریضے کو سرانجام دینے والے چند ہی اشخاص کیوں نہ ہوں) اللہ تعالیٰ آسمانی اور زمینی آفات سے اُس معاشرے کی حفاظت فرماتے ہیں۔ بصورت دیگر نتائج اس کے برخلاف نکلتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ بعض اوقات ایسی قوم کو تباہ وبرباد کر دیتے ہیں، جس میں اس فریضہ کی ادائیگی نہیں کی جارہی ہوتی۔ گزشتہ تباہ شدہ اقوام اور ہمارے درمیان کوئی بہت زیادہ زمانی فاصلہ نہیں۔

۵: اس فریضے کو افراد، اقوام اور ممالک کے لئے وضع کردہ اسالیب کے تحت ادا کیا جانا

Marfat.com

چاہیے۔ عالمی نظام میں مسلمان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جس طرح دنیا کا کوئی نظام مسلمانوں کے وجود سے خالی نہیں، اسی طرح جہاں مسلمان ہوں وہاں دہشت گردی اور بدنظمی کی بھی کوئی گنجائش نہیں، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان اپنی ذمہ داریوں کو کما حقہ ادا کرتے رہیں۔

۶: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا قیام شعائر اسلام میں سے ہے۔ قرآن وسنت میں اس فریضے کو ایمان سے علیحدہ کر کے نہیں پیش کیا گیا۔ قرآن کریم نے اہل ایمان کو ایک دوسرے کا ولی قرار دیا ہے۔ اس میں اس دوستی کو دوام بخشنے والی بنیادی وجہ کی طرف بھی اشارہ ہے، جبکہ منافق چونکہ ایک دوسرے کے دوست نہیں ہوتے، اس لئے وہ اچھے کاموں سے روکتے اور برے کاموں کی ترغیب دیتے ہیں۔

۷: اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کا ذمہ خود اٹھا رکھا ہے، لیکن یہ خدائی حفاظت تمام اہل ایمان کے عزم و ارادے اور ایک خاص جماعت کے نصرت دین کے لئے کمربستہ رہنے پر موقوف ہے۔ اس نصرت وحمایت کی واضح علامت مسلمانوں کی فریضہ تبلیغ کی کما حقہ ادائیگی ہے۔

۸: علم، عمل اور تبلیغ ایک ہی حقیقت کے تین مختلف رخ ہیں۔ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں۔ علم تبلیغ کی بنیادی شرط ہے اور تبلیغ اس کی روح۔

۹: مبلغ کو جہاں اسلام کے حقائق سے اچھی طرح واقفیت ہونی چاہیے وہیں اسے اپنے زمانے سے بھی آگاہی ہونی چاہیے۔ جو شخص اپنے زمانے سے واقف نہیں ہوتا اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص دروازے کی دہلیز کی دوسری جانب کھڑے ہو کر لوگوں کو اپنی بات سمجھانے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔

۱۰: مبلغ کے دل کے معیار قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہونے چاہئیں۔ جس شخص کا دل قرآن کریم کی تعلیمات کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو، اسلام کے حقائق کی تفہیم تو دور کی بات

Marfat.com

ہے،اس کے لئے اسلام کے نام پر گفتگو کرنا بھی دشوار ہوتا ہے۔

۱۱: مبلغ کو تبلیغ کے لئے صرف جائز ذرائع ہی استعمال کرنے چاہئیں۔ جائز مقصد تک صرف جائز ذرائع سے ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ سے ہمیں یہی راہنمائی ملتی ہے۔ مبلغ کو ان اداروں کا سا اسلوب نہیں اپنانا چاہیے، جو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ہر قسم کے ذرائع کے استعمال کو جائز سمجھتے ہیں۔ داعی حضرات کو صحابہ کرام کے نقش قدم پر چلتے ہوئے صرف انہیں ذرائع کو اختیار کرنا چاہیے، جو مکمل طور پر جائز ہوں۔ ایسے ہی لوگ دین کی حمایت و نصرت کرتے اور اسے آفاقِ عالم میں پھیلاتے ہیں۔

۱۲: مبلغ کی گفتار اور کردار میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس صورتِ حال نفاق کہلاتی ہے، جس سے مومن بہت ہی احتراز کرتا ہے۔ مبلغ کی گفتار سب سے پہلے اس کے اپنے کردار کا روپ دھارتی ہے۔ ورنہ اس کی حقیقت سوکھی اور ٹوٹی ہوئی باڑ کی طرح ہوتی ہے، جو تھوڑی دیر بھڑکتی ہے اور پھر جلد ہی بجھ کر ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔

۱۳: مبلغ شریف اور خاندانی لوگوں کی طرح ہمیشہ تواضع اور انکسار کا مظاہرہ کرتا ہے۔ دراصل ایمان خود نجابت اور شرافت کی علامت ہے۔ اس لئے مبلغ سچے ایمان دار شخص کی طرح ہمیشہ شریفانہ کام ہی کرتا ہے، یہاں تک کہ اخلاقِ نبوی اس کا مزاج اور فطرت ثانیہ بن جاتے ہیں۔

۱۴: مبلغ دعوت و تبلیغ کے علاوہ ارکانِ سلطنت یا طبقہ اشرافیہ کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات قائم نہیں کرتا۔ وہ اپنی عزتِ نفس اور شرافت کی حفاظت کی خاطر اس بارے میں انتہائی حساس ہوتا ہے۔

۱۵: مبلغ اپنی دعوت پر استقامت دکھاتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی نظر میں اپنی دعوت کا احترام ہے۔ اگر وہ اللہ کی نظر میں اہمیت کے حامل مسائل کو اہمیت نہیں دیتا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنی گفتار میں سچا نہیں۔

Marfat.com

۱۶: مبلغ قوانین فطرت کی مخالفت نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ بصیرت سے کام لیتا ہے۔ انسان میں موجود کمزور پہلوؤں کو نظرانداز کرنا ہرگز مناسب نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان میلانات کو صحیح رُخ پر ڈالا جائے۔

۱۷: مصیبتیں اور تکلیفیں مبلغ کا مقدر ہیں۔ ان سے کسی صورت مفر نہیں۔ مبلغ کو ابتداء ہی سے مصیبتوں اور تکلیفوں کو بخوشی قبول کرنا ہوگا۔

۱۸: داعی سراپا رحمت وشفقت ہوتا ہے۔ حق کے اثبات کے لئے طاقت اور سختی کے ذرائع کے استعمال کا خیال بھی اس کے دل میں نہیں گزرتا۔

۱۹: قربانی، مبلغ کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ مبلغ کو حواریوں کی صفات کو اپنانا چاہیے، بلکہ اگر کسی کی بچپن ہی سے حواریوں کے اوصاف کے مطابق تربیت نہ ہوئی ہو تو وہ ایک اچھے مبلغ کی طرح زندگی کو خیرباد نہیں کہہ سکتا۔ دعوت وتبلیغ تو سب سے پہلے قربانی کا تقاضا کرتی ہے۔

۲۰: مبلغ کو دعا (جو اخلاص کی بنیاد ہے) سے خصوصی مناسبت ہوتی ہے۔

۲۱: مبلغ ایک صاحب استدلال اور حقیقت پسند انسان ہوتا ہے، اس کا اسلوب جس قدر منطق کے اصولوں کے مطابق ہوتا ہے، اسی قدر اسے کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

۲۲: مبلغ دوسرے لوگوں کے ایمان کے بارے میں انتہائی حساس ہوتا ہے۔ کفر اور ارتداد کے واقعات دیکھ کر اس کا دل غم سے پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

۲۳: مبلغ اپنی ذمہ داری شوق ومحبت کے ساتھ سرانجام دیتا ہے۔ جب تک وہ اپنے کام کو اپنے لئے باعثِ برکت نہیں سمجھے گا اور اس کے ساتھ عشق کی حد تک لگاؤ نہیں رکھے گا اس وقت تک توفیق خداوندی اس کے شاملِ حال نہ ہوگی۔

۲۴: مبلغ مضبوط ایمان کا مالک ہوتا ہے، یعنی روحانی اعتبار سے گہرائی مبلغ کا بنیادی وصف ہے۔ یہی یقین کا مقام ہے، جس کے حصول کے بعد انسان تمام کمالات سے مالا مال

Marfat.com

ہو جاتا ہے۔

۲۵: مبلغ کو اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران اپنے دل کی سلامتی اور صحت اور روح کی پاکیزگی اور حفاظت کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے۔ خدا اور اس کے رسول ﷺ کی مدد کے حصول کے لئے مبلغ کو اپنی زندگی کم از کم اپنی دعوت کی پاکیزگی جتنی پاکیزہ بنانا ہوگی، لیکن پاکیزہ زندگی پاکیزہ روزی کے بغیر ممکن نہیں۔

☆:::::::::::☆:::::::::::☆

Marfat.com

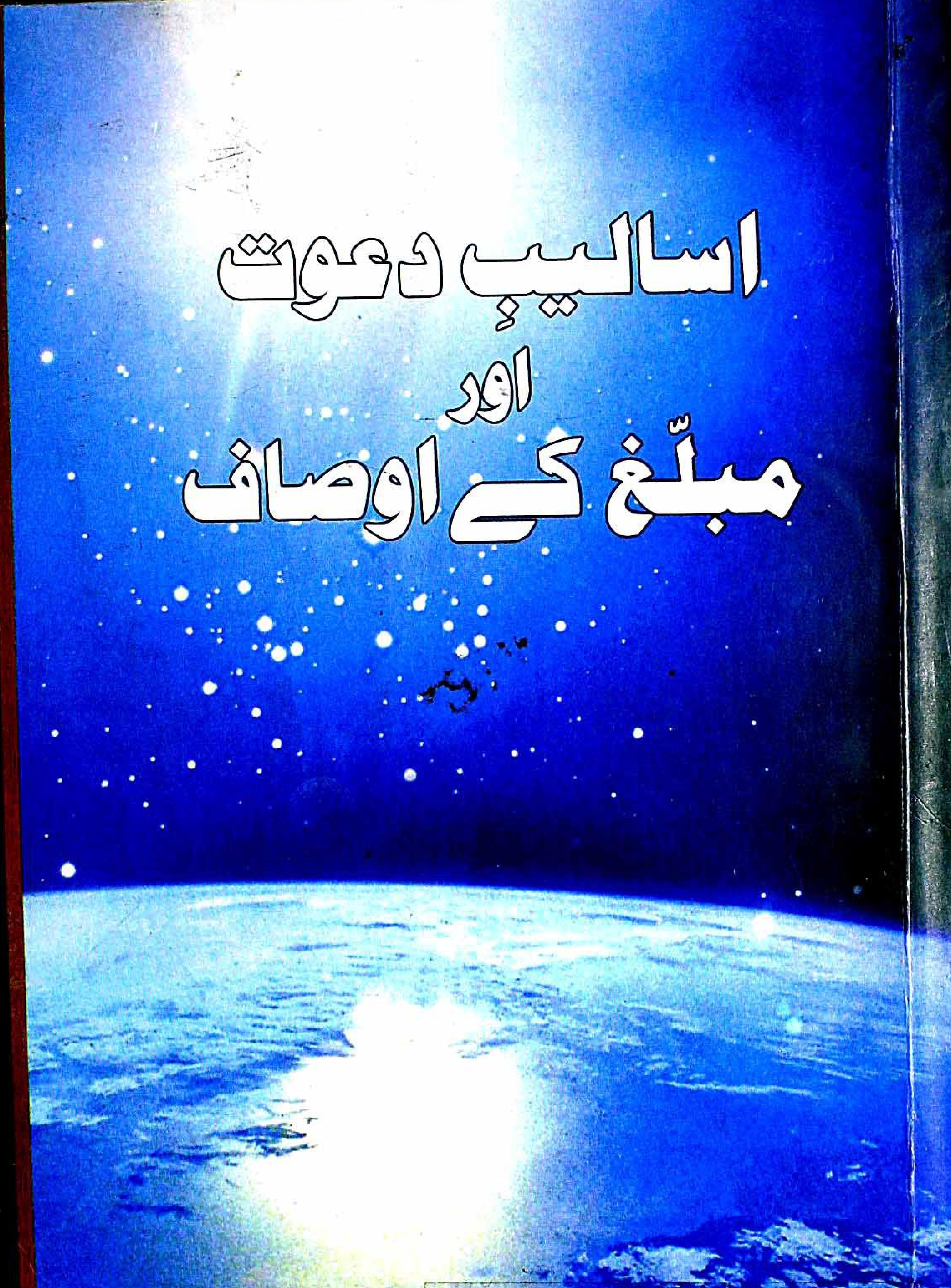

اسالیبِ دعوت
اور
مبلّغ کے اوصاف

مؤلف: محمد فتح اللہ گولن

Marfat.com